ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

جون ۲۰۱۹ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۱۲ | شوال ۱۴۴۰ء

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00روپے
سالانہ: 250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00روپے
بیرونی ممالک: $30 ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdur Rehman Naeem, email: arehman412@yahoo.in

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	عیدالفطر اور اس کا پیام	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	ہماری عید کب ہوگی؟	مدیر	۳
۳۔	قرآنیات	استقامت کا قرآنی تصور	نعمان بدر فلاحی	۸
۴۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۷
۵۔	انکار حدیث	امام ابوحنیفہ اور ان کے اجتہادی اصول (آخری قسط)	تلخیص و ترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی	۲۷
۶۔	فیمنزم	مرد و عورت کی وراثت کا مسئلہ	ترجمہ: محمد شعیب ندوی	۳۵
۷۔	افکار و نظریات	اسلامی نظریۂ تعلیم (سعید نورسیؒ کے رسائل کی روشنی میں)	ترجمانی: شفاء اللہ ندوی	۴۰
۸۔	اصلاح معاشرہ	نکاح میں لڑکی کی رضامندی اور ہمارا سماج	ابوالکلام آزاد	۴۵
۹۔	مطالعات	علمی سرقے پر جلال الدین سیوطی کا دلچسپ رسالہ	نایاب حسن	۴۷
۱۰۔	تعارف و تبصرہ	''مدارس کی تعلیم''	مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۹
	// //	''نقوش طیبات (مولانا محمد غزالیؒ نمبر)''	// محمد سہیل ندوی	۶۱
	// //	''کتاب حکمت''	// محمد پاشا ندوی	۶۲
۱۱۔	شعر و ادب	ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی	علامہ اقبالؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

ہماری عید کب ہوگی؟

جب سے احساس کی دولت ملی، کئی عیدیں ایسی گذریں کہ زبان پر کسی کا کہا ہوا یہ شعر بار بار جاری ہوگیا ؎

عید اب کہ کچھ اس طرح آئی گیت خوشیوں کے گنگنا نہ سکا
لوگ قصداً بھی خوب ہنستے رہے میں تو رسماً بھی مسکرا نہ سکا

اپنی نجی الجھنیں اور اپنے نجی مسائل اپنی جگہ، مگر غم ذات کے حصار سے باہر نکلیے تو ہر طرف غم والم کی داستانیں ہیں ظلم کی گھٹائیں ہیں، قہر کے شعلے برس رہے ہیں، پھر رمضان کا آغاز ہوا، تو غزہ پر بموں کی بارش شروع ہوگئی، معصوم نہتے خاک وخون میں نہانے لگے، ظلم کی تاریخ دوہرائی جانے لگی، لیبیا ویمن پہلے ہی سے شعلوں کی لپیٹ میں تھے، دشمن سوڈان کی تاک میں ہے، جبکہ روہنگیا اور اویغور مسلمانوں کی بے بسی کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا، مصر کے فرعون نے اپنے اقتدار کی مدت میں اضافہ کرلیا ہے، جبکہ گزشتہ سات سالوں سے مصر کے صاحبِ ایمان اور اصحابِ عزیمت جیالے مصری جیلوں میں بند ہیں، مرکز اسلام ومہبط وحی میں اسلام کو دیس نکالا دیا جارہا ہے، علماء حق اور اہل عزیمت کو جیلوں میں ٹارچر کیا جارہا ہے، کلمۂ اسلام کے متعلق صحیح وصریح گفتگو کو جرم گردانا جارہا ہے، اسلامی بیداری کے علمبردار اب یہ کہتے نظر آرہے ہیں کہ اسلامی بیداری کی بات کرنا غلطی تھی، ہم تو اس ''معتدل اسلام'' کے علمبردار ہیں جس کا نعرہ حضور ولی عہد نے لگایا ہے، ''صفقۃ القرن'' کے تحت فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کی تیاری ہے، ارض حشر ونشر کو اہل اسلام سے خالی کرانے کی تیاری ہے، ملک شام کو تقریباً صحیح العقیدہ اہل سنت سے خالی کرالیا گیا ہے، ۱۲ سے ۱۵ لاکھ مسلمان شہید کردیے گئے اور تیس سے چالیس لاکھ ہجرت کرنے پر مجبور ہوچکے ہیں۔ فلسطینی مزاحمتی تحریک سے وابستگی کے جرم میں جزیرۃ العرب میں رہنے والے فلسطینیوں کو بھی گرفتار کیا جارہا ہے، جزیرۃ العرب کے طول وعرض پر پابندیوں کے جال بچھائے جارہے ہیں، کفر کے علمبرداروں کو نشانِ امتیاز عطا کیے جارہے ہیں، شرک سے پاک کردی گئی سرزمین پر پھر سے شرک کے مظاہر اور شرک کے اڈے قائم کیے جارہے ہیں، حالات ایسے مہیب اور سنگین ہیں کہ آدمی ذات کے حصار سے باہر نکل کر سوچے تو اس کے لیے کھانا پینا مشکل ہوجائے چہ جائیکہ وہ عید کی خوشیاں منائے۔

خود اپنی ملکی صورت حال پر نظر ڈالیے تو عرصۂ حیات تنگ ہوتا نظر آتا ہے، اس میں بڑی حد تک اس ملک میں

قیادت کے فقدان یا قیادت کی گروہ بندیاں اور چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونے کو بڑا دخل ہے، خدا کرے کہ اندیشے سب غلط ثابت ہوں اور ملت مرحوم کی قدرت غیب سے حفاظت کرے، مگر دستورِ الٰہی تو یہ ہے کہ اگر کام صحیح رخ پر نہ ہو، وسائل کا استعمال صحیح نہ ہو تو پھر قدرت سبق سکھانے کا سامان کرتی ہے، موجودہ انتخابات کے دوران جس قدر دھاندلیوں کی خبریں آئی ہیں اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا، واقعہ یہ ہے کہ یہ الیکشن بی جے پی نے کمال ہوشیاری سے لڑا ہے، ۲۰۱۴ء اور پھر اس کے بعد یوپی کے انتخابات بی جے پی نے مکمل اکثریت کے ساتھ مشینوں کی مدد سے جیتا تھا، جب سوالات بہت اٹھے اور تھُو تھُو بہت ہوئی تو دیگر صوبوں کے انتخابات میں رنگ بالکل بدلا ہوا نظر آیا اور کچھ ڈرامہ کے جیسے مناظر سامنے آئے، راقم سطور کو اسی وقت یقین ہو گیا تھا کہ ۲۰۱۹ء کے انتخابات بی جے پی کمال ہوشیاری سے لڑ کر جیتے گی، آپ کو یاد ہوگا کہ ۲۰۱۴ء میں اور پھر یوپی میں تمام سروے رپورٹ میں پہلے ہی بی جے پی کو اکثریت دے دی گئی تھی، مگر اس بار ایسا نہیں کیا گیا، تاکہ مشینوں سے توجہ ہٹائی جا سکے، بہر حال بی جے پی بھلے ہی اس قدر اکثریت سے نہ آئے مگر واپسی اسی کی ہے (دعا تو یہی ہے کہ ایسا نہ ہو)، مقابلہ کیسے کرنا ہے، یہ پالیسی ہم کو بنانا ہوگا، وقت بدل رہا ہے، حالات بدل رہے ہیں، سوشل میڈیا نے زہر پھیلانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے، اس لیے آنے والے وقت میں بدلتے ہوئے حالات سے نمٹنے کے لیے اپنی پالیسی کو تبدیل کرنا ہوگا، متحدہ اور ٹھوس بنیادوں پر آگے بڑھنا ہوگا ورنہ بات بگڑتی جائے گی، تھوڑی دیر کے لیے مان لیجئے کہ بی جے پی نہیں آتی ہے تو پھر.....؟ تو پھر ایک ملی جلی حکومت بنے گی مگر اس کی عمر ۶ ماہ بھی نہیں ہوگی کیوں کہ کانگریس سے بہت زیادہ سیٹیں جیتنے کی امید فضول ہے، اور پھر واپسی بھاجپا کا مقدر بنے گی، ہماری قیادت ہمہ وقت آئینِ ہند کا حوالہ دیتی ہے، مگر آئین نو کا جنوں اب آئین ہند کو بدل ڈالنے پر آمادہ ہے، جس کی جھلکیاں دکھائی جا چکی ہیں، خدا نہ کرے کہ آئندہ موقع ملے ورنہ مزید تبدیلی کے امکان ہیں۔

آئین سے کھلواڑ عین الیکشن کے دوران خوب نظر آیا، ایک طرف دہشت گردی کی ملزم سادھوی پرگیہ طبیعت کی خرابی کے لیے ضمانت پر باہر آئی اور بی جے پی نے اس کو امیدوار بنایا، اس نے علی الاعلان گاندھی جی کے قاتل گوڈسے کو دیش بھکت کہا، دوسری طرف ڈرامائی انداز میں تیج بہادر کا پرچۂ نامزدگی رد کیا گیا، ایک نیوز چینل کے آپریشن میں یہ سازش بے نقاب ہوئی۔

بیدار مغز اور دانشمند وہ لوگ ہوتے ہیں جو شریعت کے دائرہ میں رہ کر اس دین متین کی وسعتوں سے فائدہ اٹھائیں، اس کی بنیادوں پر جم جائیں اور روایت پسندی کے حصار سے نکل کر خود ہی مستقبل کے تحفظات فراہم کریں اور دشمن کی ہر چال ناکام بنائیں، تنگ نظری اور کہنہ دماغی سے اس امت کو ہمیشہ نقصان ہوا ہے، ذرا سوچیے کہ مدارس کا نظام ہندستان کا کتنا بڑا اور وسیع نظام ہے، دینی تعلیم اور ایک بڑے طبقہ کے روزگار کے لیے اتنا بڑے نظام کے تحفظ کا کوئی ذریعہ؟ صرف دستور ہند کا سہارا، بدلتے ہندستان میں اس شق کو بدل ڈالنے میں کتنی دیر لگے گی، کبھی اس ناحیہ سے سوچ کر اس اتنے بڑے جمے جمائے نظام کو تحفظ

فراہم کرنے کو یقینی بنایا گیا؟ ہم نے کئی بار اس سلسلہ میں ایسی آراء رکھیں جن سے مدارس کا تشخص بھی باقی رہتا، وہ اپنا کام بھی کرتے، اور حکومت انھیں اپنے دائرے سے باہر سمجھ کر ان پر انگلی بھی نہ رکھتی، کانگریس کی وفاداری کے عوض یہ کام کرایا جاسکتا تھا مگر نہ ہوا، اگر مسلمان ایک بورڈ منظور کرا کر مدارس کے ثانویہ کو اس سے جوڑ دیتے اور بورڈ سے ہائی اسکول کی سند ملتی تو یہ اس ملک کی تاریخ میں بڑا کارنامہ قرار پاتا، بہرحال اب تو اندیشے ہیں، امکانات ہیں، الجھنیں ہیں، مسائل ہیں اور ان ہی کے درمیان عید ہے، جب ملت کے جسم کا ہر ہر عضو درد سے کراہ رہا ہو، تڑپ رہا ہو، پورا جسم زخموں سے چور اور نڈھال ہو تو پھر عید کیسی؟ اور سوال یہ بھی ہے کہ آخر یہ عید ہے کیا؟

یہ عید دراصل شکرانہ ہے اس ماہ مبارک کی تکمیل کا جو نیکیوں کا موسم بہار تھا، جس کا ہر پل قیمتی اور باعث خیر و برکت تھا، جس کے روزے فرض کیے گئے تھے اور جس میں کارِ خیر پر بے حد و حساب ثواب کا اعلان کیا گیا تھا قرآن مجید نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے ولتکملوا العدة ولتكبروا الله على ماهداكم ولعلكم تشكرون (بقرہ:۱۸۵) ''اور یہ مقصود ہے کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہدایت دی ہے اس پر اس کی عظمت و کبریائی کے گن گاؤ تاکہ تم (اس کی نوازشوں کا) شکر ادا کرو''، اس لیے مسلمانوں کی عید دیگر قوموں کی عید کی طرح نہیں، اس میں شرک کی خرافات، بدعات وضلالات اور اسراف وفسق کا گذر نہیں، بلکہ مسلمانوں کی عید اظہار تشکر کا ذریعہ ہے، روزہ دار کو ایک خوشی تو افطار کے بعد نصیب ہوتی ہے مگر بڑی خوشی ماہ مبارک کے مکمل روزوں کی تکمیل کے بعد حاصل ہوتی ہے، مسلمانوں کی زندگی میں یہ وہ موقع ہوتا ہے جب وہ شرعی اور قانونی طور پر اظہار مسرت کر سکتے ہیں، قل بفضل الله وبرحمته فبذلك فليفرحوا (یونس:۵۸) ''کہہ دیجئے کہ ان کو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوش ہونا چاہیے''۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس عید کے اور بھی بہت سے پہلو سامنے آئیں گے اور عید کے حقیقی معنی سمجھنے میں ہمارے لیے بڑے معاون ہوں گے۔

عید کا پیغام یہ ہے کہ ہماری پوری زندگی اکمالِ دین کی نعمت ملنے کے سبب عید ہو، ہمہ وقت اس نعمتِ عظمی کو گلے لگانے کی فکر ہو اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا (مائدہ:۳) عید کا پیغام یہ ہے کہ عبادتوں میں دوام وتسلسل ہو، اقامتِ دین کی کوششیں اپنے بس بھر جاری رکھی جائیں، ہمیشہ طاعات کی عادت ڈالی جائے، عبادات کا ذوق عام ہو، جذبۂ شکر گذاری عام ہو، گناہوں سے شرم کی جائے، منکرات سے بچا جائے، خیر کو فروغ دیا جائے واعبد ربك حتى يأتيك اليقين (حجر:۹۹) ''اور جب تک یقینی فیصلہ (موت) نہ آجائے اپنے رب کی بندگی کرتے رہیں'' عید کا پیغام یہ ہے کہ نعمتوں پر منعم کا شکر ادا کیا جائے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوا جائے قل من حرم زينة الله التى أخرج لعباده والطيبات من الرزق، قل هى للذين آمنوا فى الحياة الدنيا خالصة يوم القيامة (اعراف:۳۲) ''(ان سے) کہئے کہ اللہ کی عطا کردہ عمدہ چیزوں کو کس نے حرام قرار

دیا؟ جن کو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، اور پاکیزہ رزق کس نے ممنوع کر دیا؟ اور یہ بتا دیں کہ یہ سب چیزیں دنیا کی زندگی میں اصلاً ایمان والوں کے لیے ہیں، اور قیامت میں تو خالص ان ہی کے لیے ہوں گی''۔عید کا پیغام یہ ہے کہ ہماری اصل خوشی ہمارے دین میں ہے، عبادتوں میں ہے، نماز، روزہ، نوافل، صدقات، اذکار اور دین خداوندی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے والے کاموں میں ہے، عید اپنے اندر رجوع الی الاسلام کا طاقتور پیغام رکھتی ہے، جماعت و اجتماعیت اور اتحاد ملت و وحدتِ امت کی نوید سناتی ہے، عید پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہ موقع اصلاحِ حال اور اصلاحِ اعمال کا ہے، یہ موقع اصلاح معاشرہ کا ہے، یہ موقع خوشیاں بانٹنے اور غموں کو کافور کرنے کا ہے، یہ موقع جلن، کینہ اور حسد کو نکال پھینکنے کا ہے، عید صلہ رحمی کی دعوت دیتی ہے، یتیموں مسکینوں اور بیواؤں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کا پیغام دیتی ہے، عید کی منشا ہے کہ اس موقع پر پڑوسیوں اور رشتہ داروں کو ہی نہیں بلکہ اخوت اسلامی کے رشتہ میں منسلک تمام افراد امت کو یاد رکھا جائے، عید کا موقع بہترین موقع ہے گلے اور شکوے مٹا کر ایک ساتھ خوشیاں منانے کا، ٹوٹے ہوئے دلوں کی دلجوئی خدا کو بہت پسند ہے، کسی مسلمان کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا عمل اللہ کے یہاں بہت محبوب ہے، عید زبان حال سے کہتی ہے کہ جو لمحہ بھی معصیتِ الٰہی سے خالی ہو اور طاعت باری سے معمور ہو وہی عید ہے۔

عید کے اس انسانی پہلو پر بھی غور کر لیجئے کہ عید الفطر کے ساتھ صدقہ فطر کو بھی جوڑ دیا گیا، تاکہ توازن قائم رہ سکے، صاحب حیثیت صدقہ فطر ادا کر دیں تاکہ بے حیثیت بھی عید کی مسرتوں میں شریک ہو سکیں، کیا خوب ہو کہ اہل ثروت صدقہ فطر گیہوں اور جو سے نہیں بلکہ کھجور و کشمش سے ادا کریں، جو جس قدر مالدار ہو وہ اسی اعتبار سے ان چار چیزوں میں سے کسی چیز کو معیار بنائے اور کم از کم کوشش یہ کرے کہ اس کے غریب رشتہ دار و پڑوسی اور نوکر چاکر اور ان کے بچے ویسے ہی خوشی منائیں جیسے اس کے اپنے بچے، صدقہ فطر اور اس کا نصاب جس ماحول میں مقرر کیا گیا اس کی حکمت پر ذرا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صدقہ فطر کی مشروعیت کا اصل مقصد کیا ہے اور کشمش و کھجور کا نصاب ایک صاع اور گندم و جو کا نصاب نصف صاع کیوں رکھا گیا۔

یہ ہے عید! مگر ہماری حقیقی عید کب ہوگی؟ ظاہر ہے کہ ہم امت اسلامیہ کے احوال سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے، ہم ایک لمحہ کے لیے بھی غزہ کی ماتم کرتی بیواؤں اور چیختی پکارتی ماؤں کو نہیں بھول سکتے، مصر کی جیلوں میں قید شیدائیان اسلام کو ہم فراموش نہیں کر سکتے، ہم شام کے بے حال مظلوموں سے چشم پوشی نہیں کر سکتے، برما کے بے حال مسلمانوں اور یمن کے بھوک سے تڑپتے بچوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، ان کے غم ہمارے غم ہیں، ان کی تکلیف ہماری تکلیف ہے، ان پر جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اس سے ہم غافل نہیں، یہ ہماری بے بسی ہے کہ ہم دعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے، لیکن ہماری یہ دعائیں اور ہمارا یہ تڑپنا بھی رائیگاں نہیں جائے گا وما تقدموا لأنفسكم من خير تجدوه عند الله إن الله بما تعملون

بصیر (بقرہ:۱۱۰) ''جو بھی نیکی اور بھلائی اپنے لیے آگے بھیج دو گے اسے اللہ کے یہاں پاؤ گے، اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے''۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ تو یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی قاضی کو انصاف کرتے سنتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ شاید کبھی انصاف کے لیے اس سے میرا واسطہ نہ پڑے، میں سنتا ہوں کہ مسلمانوں کے کسی شہر میں بارش ہوئی تو خوشی ہوتی ہے، حالانکہ وہاں میرا ایک جانور بھی نہیں جو اس کے سبزے سے اپنا پیٹ بھرے، اور پھر نبی پاک ﷺ نے یہی تو فرمایا تھا کہ جو مسلمانوں کے امور میں دلچسپی نہ لے وہ ہم میں سے نہیں، بے شک ہماری حقیقی عید تب ہوگی جب ہمارے یہ مسلم ممالک دشمنوں کے پنجوں سے آزاد ہوں گے، جب ہمارے ان بے گناہ قیدیوں کو باعزت رہائی نصیب ہوگی، جب ہمارا قبلہ اول آزاد ہوگا، ورنہ عید ہے، طاعت الٰہی میں سر جھکا ہوا ہے، بدن پر نیا لباس ہے، مگر دل مغموم ہے، آنکھوں میں بے بسی کی تصویر ہے، بے کسی کا درد ہے، ایک طرف اپنے بچوں کی خوشی ہے، مگر فلسطینی بچوں کی گردن پر ناپاک یہود کے پاؤں رکھے ہونے کا منظر سامنے ہے، عالم اسلام میں بھیک مانگتے شامی بچے ہیں، ان کے معصوم چہرے اور کپکپاتے ہاتھ ہیں، جب ان غموں سے نجات ملے گی تو عید ہوگی ویسے بھی ایک مومن کی حقیقی عید حدیث کے بموجب اس وقت ہوگی جب خدا تعالیٰ فرمائیں گے کہ آج ہم تم کو اپنی رضا کا پروانہ دیتے ہیں، آج کے بعد ہم تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوں گے، یہ عید اور اس طرح کی تمام طاعتیں وعبادتیں دراصل اسی حقیقی خوشی اور کامیابی کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تعالیٰ یقول لأهل الجنة، یا أهل الجنة، فیقولون لبیك ربنا وسعدیك، والیر كله فی یدیك، فیقول: هل رضیتم؟ فیقولون: وما لنا لا نرضی یارب، وقد أعطیتنا ما لم تعط احدا من خلقك، فیقول "ألا اعطیتكم أفضل من ذلك، فیقولون یا رب وأی شیء افضل من ذلك؟ فیقول أحل علیكم رضوانی فلا أسخط علیكم بعده أبدا (متفق علیہ)

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑ قرآنیات

استقامت کا قرآنی تصور

نعمان بدر فلاحی

''استقامت'' کے لفظی معنیٰ ''سیدھے رہنے'' یا ''سیدھے چلنے'' کے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم و دائم رہا جائے۔مصائب ،آلام اور مشکلات و مسائل پیش آئیں، مخالفتیں ہوں یا ستایا جائے تو اسے برداشت کیا جائے اور حق سے منہ موڑنے کے بجائے اُس راستے پر ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ :

أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ (حٰم السجدہ : ٦)

''تمہارا معبود تو بس ایک ہی ہے، لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اسی سے معافی کے طلب گار بنو''۔

مندرجہ بالا آیت میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ توحید کی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ راہ سے بہکو اور نہ حکم عدولی کرو :

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (ھود : ۱۱۲)

''تو (اے نبی) تم اور تمہارے وہ ساتھی جنہوں نے توبہ کر لی ہے راہ راست پر ثابت قدم رہیں جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے۔اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے اعمال پر نگاہ رکھتا ہے''۔

یعنی ہماری تمام عبادتیں اسی کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو۔اُس سے کسی حال میں بھی اِدھر اُدھر نہ ہُوا جائے اور سیدھے اسی کی طرف چلا جائے۔

جب عرب کا تپتا ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ،ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں آواز نکلنے لگی اور عرب کی وسیع و عریض سرزمین مسلمانوں پر تنگ ہونے لگی تو اِس موقع پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید فرمائی گئی :

فَلِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (شوریٰ: ۱۵)

''اس لیے اب تم اسی (دین) کی طرف سب کو بلاؤ اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو''۔

ایسے ثابت قدم لوگوں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا رب مان کر ہر طرح کے خوف وخطر کو اپنے دل سے نکال دیا ہے' یہ خوش خبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے۔وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (احقاف:۱۳)

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اُس پر جمے رہے تو اُن کے لیے نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

جن کو یہاں استقامت اور ثابت قدمی حاصل تھی، صرف انہی کو وہاں تسکین و تسلی حاصل ہوگی جب کہ اُس دن ہیبت اور خوف سے سب کے دل لرز رہے ہوں گے۔ ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں فرشتے بشارت سنائیں گے :

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنتُمْ تُوعَدُونَ (حٰمٓ السجدہ : ۳۰)

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جمے رہے، اُن پر فرشتے اترتے ہیں جو اُن سے کہتے ہیں کہ نہ خوف کھاؤ اور غم نہ کرو، بلکہ خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں'' یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جو دنیا سے لے کر آخرت تک ہر مرحلے میں اہل ایمان کے لیے تسکین کا ایک نیا مضمون اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں فرشتوں کی اس تلقین کا مطلب یہ ہے کہ باطل طاقتیں خواہ کتنی ہی بالا دست اور چیرہ دست ہوں، اُن سے ہرگز خوف زدہ نہ ہو اور حق پرستی کی وجہ سے جو تکلیفیں اور محرومیاں بھی تمہیں سہنی پڑیں اُن پر کوئی رنج نہ کرو، کیونکہ آگے تمہارے لیے وہ کچھ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہی کلمات جب موت کے وقت فرشتے کہتے ہیں تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تمہارے لیے خوف کا مقام نہیں ہے کیونکہ وہاں جنت تمہاری منتظر ہے۔ اور دنیا میں جن کو تم چھوڑ کر جا رہے ہو اُن کے لیے تمہیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں ہم تمہارے ولی و رفیق ہیں۔ عالم برزخ اور میدان حشر میں جب فرشتے یہی کلمات کہیں گے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں تمہارے لیے چین ہی چین ہے۔ دنیا کی زندگی میں جو حالات تم پر گزرے اُن کا غم نہ کرو اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اُس کا خوف نہ کھاؤ۔ اِس لیے کہ ہم تمہیں اُس جنت کی بشارت دے رہے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے''۔

ایک مرتبہ عقیدۂ توحید قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اُس پر قائم رہنا، اپنی عملی زندگی میں اس کے تقاضوں کو پورا کرنا، اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کرنا، اور اُس کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش سے بچنا توحید پر ثابت قدمی کے لیے لازمی ہے۔ توحید پر استقامت کی تشریح نبی ﷺ اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس طرح کی ہے :

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، مگر اُن میں سے اکثر کافر ہو گئے۔ ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اسی عقیدے پر جما رہا'' (ابن جریر، نسائی، ابن ابی حاتم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا ''خدا کی قسم استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے اور لومڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتے نہ پھرے''۔ (ابن جریر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اللہ کے عائد کردہ فرائض فرمانبرداری کے ساتھ ادا کرتا رہے''۔ (کشّاف)

عن سفيان ابن عبد الله الثقفى قال : قُلْتُ يا رسولَ الله ﷺ قُلْ لِيْ فِي الإِسْلامِ قولًا لَا اَسْئَلُ عَنْهُ اَحداً بَعْدَكَ ، فقال : قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ ۔(صحيح مسلم ،كتاب الايمان باب جامع

اوصاف الاسلام)

حضرت سفیانؓ بن عبداللہ ثقفی کہتے ہیں ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا مجھے اسلام کے سلسلے میں ایک ایسی بات بتا دیجئے کہ میں اس کو آپؐ کے بعد پھر کسی سے نہ پوچھوں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:تم کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر ثابت قدم رہو''۔

ایک صحابی دریافت کرتے ہیں ''یارسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتایئے کہ میں اُس سے چمٹ جاؤں'' تو ارشاد ہوا کہ ''کہو میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ'' (ترمذی ابواب الزہد، باب ماجاء فی حفظ اللسان، ج۲،ص۶۶)

صحابۂ کرام ؓ نے اِن نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے انجام دیے، ۱۴سو برس گذرنے کے بعد بھی اُن پر تاریخ کی زبان سے مستقل احسنت اور آفرین کی صدائیں بلند ہورہی ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر اُن کی استقامت کا نقشہ کھینچا ہے :

إِذْ جَاؤُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتْ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا o هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالاً شَدِيْداً (احزاب: ۱۰)

''جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے چڑھ آئیں اور جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے،اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے،اُس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے''۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيْمَاناً وَتَسْلِيْماً (احزاب: ۲۲)

''اور جب ایمان والوں نے کفار کی اُن متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ ہی کہا تھا۔اور اِس بات نے اُن کے ایمان اور اطاعت میں اور اضافہ کیا''۔

جب مسلمانوں نے اِنتہائی خطرناک حالات میں اپنی استقامت اور ثابت قدمی کے وعدوں کو پورا کیا تو اُن کی تعریف کی گئی :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيْلاً (احزاب: ۲۳)

''ایمان والوں میں ایسے مرد موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا۔اُن میں سے کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، اور انہوں نے اپنے رویّے کو ذرا بھی نہیں بدلا''۔

یعنی بعض تو اللہ کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض پورا کر چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اُس دن کی راہ تک رہے ہیں جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور اُن تمام خطرات کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین وایمان کو بدلا اور نہ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑا۔

راہ حق میں مشکلات کا پیش آنا اور اُس میں مردانِ خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی۔فرمایا :

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء وَزُلْزِلُواْ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِيْنَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّهِ

أَلا إِنَّ نَصرَ اللّهِ قَرِيبٌ (بقرہ: ۲۱۴)

''کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے، حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے۔ اُن پر سختیاں آئیں، تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اُس وقت ان سے کہا گیا) سنو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے''۔

مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ فرض کرو اگر یہ رسول مرجائے، یا قتل کردیا جائے تو کیا تم ثابت قدم رہنے اور راہ حق پر استقامت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللّهَ شَيْئاً (آل عمران: ۱۴۴)

''اور محمد تو بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، تو کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا''۔

گزشتہ امتوں کا حال سنا کر بھی ایمان والوں کو تسلی نیز صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دی گئی ہے :

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُواْ لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَمَا ضَعُفُواْ وَمَا اسْتَكَانُواْ وَاللّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ oوَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلاَّ أَن قَالُواْ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (آل عمران: ۱۴۶)

''اور کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی، مگر اللہ کی راہ میں اُن پر جو مصیبتیں آئیں اُن سے وہ ہمت نہیں ہارے، اور انہوں نے نہ تو کمزوری دکھائی اور نہ دبے۔ ایسے ہی صابروں سے اللہ پیار کرتا ہے۔ اور اُن کا کہنا بس یہ تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ اور اپنے کام میں ہم سے جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمادے اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد کر''۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثابت قدمی کی یہی کیفیت ہونی چاہئے۔ اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک دوسری چیز استقامت عمل ہے جس کا نام مداومت ہے۔ نیکی اور بھلائی کے جس کام کو اختیار کیا جائے اُس پر مرتے دم تک مُداومت رہے، یعنی اس کو ہمیشہ اور ہرحال میں کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کبھی کیا اور کبھی نہیں کیا۔ نماز پڑھنا انسان کے اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف اُن مسلمانوں کی کی ہے جو اُس کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں :

إِلَّا الْمُصَلِّينَ oالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (معارج: ۲۲،۲۳)

''لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں''۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب تھا؟ فرمایا: وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو''۔ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد ومداومۃ العمل، ج۲، ص۹۵۷)

استقامت کی تاریخی مثالیں :

پچھلی امتوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اُس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں۔ ایک واقعہ طالوت کے مختصر

سے لشکر کا ہے جس نے قلت تعداد اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا۔ اُس وقت اُن کی زبان پر یہ دعا جاری تھی :

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْراً وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (بقرہ: ۲۵۰)

''اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر، اور ہمارے قدم جما دے اور اِس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر''۔

دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے۔ احادیث وسیر کے مطابق یمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمانوں کو یہودیوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر کار اُن کو گڈھا کھود کر آگ میں جھونک دیا مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے :

قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ○ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ○ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ○ وَّهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ○ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (بروج: ۴-۸)

''مارے گئے اُن گڑھوں کو کھودنے والے جس میں بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی، جب کہ وہ اُس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ اُن ایمان والوں سے بدلہ صرف اِس وجہ سے لے رہے تھے کہ وہ لوگ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے''۔

استقامت کے وہ احوال وکوائف جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا، ان میں سے ایک واقعہ امام بخاریؒ نے صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت خبابؓ بن ارت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجیے۔ چوں کہ یہ بھی ایک طرح کی بے تابی کا اظہار تھا اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا :

''تم سے پہلے کے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اُس کو دین حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا اور لوہے کی کنگھیوں سے اُس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اُس کو اُس کے دین سے ہٹا تا نہ تھا'' (صحیح بخاری، کتب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام، ج۱، ص۵۰۴)

علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی تصنیف ''سیرت النبی ﷺ'' میں مسلمانوں پر ظلم اور ان کی استقامت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''بہر حال قریش نے جور وظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کیے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ ریتیلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے۔ یہ مصیبتیں اگر چہ تمام بیکس مسلمانوں پر عام تھیں لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے ان کے نام یہ ہیں :

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اُس زمانے میں اسلام لائے جب آنحضرت ﷺ حضرت ارقمؓ کے گھر میں مقیم تھے اور صرف چھ، سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا،

ایک شخص چھاتی پر پانوں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہوگئے۔ خباب ؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمر ؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی۔ حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کی بقایا تھی، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمد ﷺ کا انکار نہ کروگے ایک کوڑی نہ ملے گی۔ یہ کہتے کہ ''نہیں، جب تک تم مرکر پھر جیو نہیں''۔

حضرت بلال ؓ۔ یہ وہی بلالؓ ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہوجاتی تو امیہ اُن کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں۔ ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ! ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے 'احد' کا لفظ نکلتا۔ جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا۔ وہ ان کو شہر کے اِس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھرتے لیکن اب بھی وہی رٹ تھی، احد احد۔

حضرت عمار ؓ یمن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ''یاسر'' مکہ میں آئے، ابوحذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہ تھا، شادی کردی، عمار انہی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے۔ قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بیہوش جاتے۔ ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہؓ حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں، ان کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور ہلاک ہوگئیں۔ حضرت یاسرؓ، حضرت عمارؓ کے والد تھے۔ یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہوگئے۔

آنحضرت ﷺ نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمار بن یاسرؓ ایک ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، آپ ﷺ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہوگئے۔ قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہوجاتے تھے۔ جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا مال ومتاع چھوڑ جاؤ تو جاسکتے ہو، انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔

حضرت ابوفکیہہ ؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلال ؓ کے ساتھ اسلام لائے، امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پانوں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں۔ ایک ''گبریلا'' راہ میں جارہا تھا، امیہ نے ان سے کہا ''تیرا خدا یہی تو نہیں ہے'' انہوں نے کہا میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے'' اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا۔ ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

حضرت لبینہؓ، یہ بے چاری ایک کنیز تھیں۔ حضرت عمر ؓ ان بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں''۔ وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ ''اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا''۔

حضرت زنیرہؓ حضرت عمر ؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے، ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ یہ دونوں بھی کنیز تھیں اور

اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔

حضرت عثمانؓ جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا۔ حضرت ابوذرؓ جو ساتویں مسلمان ہیں، جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا۔ حضرت زبیر بن العوامؓ جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی سعید بن زیدؓ جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا لیکن یہ تمام مظالم اور یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں، ایک مسلمان کو بھی راہ حق سے متزلزل نہ کرسکیں''۔ (سیرت النبی ﷺ اول، ص۱۶۲-۱۶۵)

حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر اللہ کی راہ میں جان کی یہ قربانی اُن کو اتنی پسند آتی ہے کہ شکرانہ کی ۲ رکعت ادا کرتے ہیں۔ تابعین کے دور میں حضرت سعید بن جبیرؒ حجاج بن یوسف کے سامنے استقامت کی چٹان بن کر کھڑے ہوگئے، امام احمد بن حنبلؒ نے خلق قرآن کے مسئلے میں صبر و استقامت کا ایک بے مثال اور تاریخی کردار پیش کیا۔ عصر حاضر میں تحریک اخوان المسلمون کے رہنما امام حسن البناء، سید قطب اور زینب الغزالی کے علاوہ دیگر اکابرین نے حکمرانوں کے انتہائی جبر و تشدد کے سامنے عزم، حوصلے، صبر، استقلال اور استقامت کا پہاڑ بن کر اپنی دعوت کو جاری رکھا اور سرمو انحراف نہیں کیا۔

خود رسول اللہ ﷺ کا وہ فقرہ جو آپ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کے جواب میں کہا تھا' اس کی تاثیر اُس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے۔ فرمایا'' چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اِس دین سے باز نہ آؤں گا''۔

معروف مصنف اور اسلامی دانشور سید اسعد گیلانیؒ کفر کے مقابلے میں نبی اکرم ﷺ کے طرز عمل کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

'' رسول اللہ ﷺ نے اپنی تمام تر مادی مشکلات، افرادی قوت کی کمی، دشمنوں کی بھاری تعداد، کثیر وسائل اور پرہجوم مخالفت کے باوجود ہمیشہ ڈٹ کر رہنے کا پرعزیمت راستہ اختیار کیا۔ آپ ﷺ کبھی بھی کفار کی کثرت تعداد اور کثرت سامان سے مرعوب نہیں ہوئے اور نہ ہی اُن کے رعب میں آکر اپنی پالیسی اور طرز عمل کو نرم کیا۔ جتنی نرمی حضورؐ کے مزاج میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں تھی' اسی قدر سختی اور استقامت کفار کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں تھی۔ اللہ تعالیٰ کا بھی حضور ﷺ کے لیے یہی حکم تھا۔ ایک اسلامی تحریک کفر کے نرغے میں ایسا ہی پروقار طرز عمل رکھنے پر مامور ہوتی ہے۔ کافروں کے دباؤ سے دب کر صلح کی درخواستیں کرنا اور اپنی پالیسیاں تبدیل کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔ فرمایا گیا:

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ (محمد: ۳۵)

''پس تم سست نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو، تم ہی غالب رہنے والے ہو''۔

غرض حضور اکرم ﷺ نے مکہ کی سخت ترین حالت میں بھی جب کہ جان کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا تھا اور دوسری طرف لالچ کے بے شمار مواقع موجود تھے آپ ﷺ نے کفار کی

درخواست اور خواہش کے باوجود اُن کی کسی دھمکی اور حملے کی پرواہ کیے بغیر نہ دب کر صلح کی اور نہ اُن کے سامنے امن و سلامتی کی درخواستیں پیش کیں۔ شعبِ ابی طالب کا تین سالہ دورِ عسرت گزارا، بھوکے بچوں کو بلکتے دیکھا، کمزور مسلمانوں کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پایا، مدینہ میں کفار کا نرغہ، معاشی مقاطعہ اور بار بار کے جن لیوا حملے برداشت کیے' لیکن دشمن سے دب کر رہنے اور اپنی جان بچانے کے لیے درخواستیں دینے کا رویہ کبھی اختیار نہیں کیا''۔ (رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب، ص ۵۹۱)

فریضہ دعوت اور استقامت :

مشہور اخوانی رہ نما مصطفیٰ مشہور اپنی تصنیف ''طریق الدعوۃ'' میں لکھتے ہیں :

''دعوت کے ابتدائی مرحلے میں جہاد کی صحیح اور بہترین شکل اذیتوں اور تکالیف پر صبر، حق پر استقامت اور تبلیغ دعوت پر اصرار ہے جو کبھی کبھی شہادت تک پہنچتی ہے، جیسا کہ حضرت یاسرؓ اور سمیہؓ کے ساتھ پیش آیا۔ یہی تین چیزیں صبر، استقامت اور تبلیغ دعوت' دعوت کی زندگی کا راز اور اس کی بقا اور توسیع و اشاعت کا ذریعہ تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یاسرؓ، سمیہؓ، بلالؓ اور اُن کے علاوہ اُن جیسے دیگر لوگوں ہی نے اُس وقت دعوت کے لیے ایک اہم اور کلیدی رول ادا کیا تھا۔ جب بھی ہم ان کی سیرت پڑھیں گے ان کے موقف اور عمل سے نوشتۂ جہاد اور قوت محرکہ حاصل کرتے رہیں گے۔ کیونکہ ایذا رسانیوں پر صبر، حق پر ثابت قدمی اور پیہم تبلیغ دعوت کے نتیجہ میں ایمان میں وہ پختگی اور عقیدہ میں وہ قوت پیدا ہوجاتی ہے جو بالآخر اہل باطل کی شکست کا باعث بنتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا احساس ابوجہل کو حضرت بلالؓ کی ثابت قدمی دیکھ کر ہوا تھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس مرحلہ میں جہاد، تربیت نفوس اور قربانی وایثار پر لوگوں کو تیار کرنے کی اہمیت سے غافل تھے۔ اِس کی بہترین شہادت بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ ہیں۔ اُن میں جو معاہدے کیے گیے ہیں وہ صاف طور سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کردیتے ہیں۔

ہم نے بار ہا دعوت اسلامی کی قدیم وجدید تاریخ میں کچھ ایسی نیک بیبیوں کی شریف اور معزز تصویریں دیکھی ہیں جو اپنے شوہروں کی معاون اور مددگار تھیں، اُن میں سب سے زیادہ تروتازہ اور مقدم اُم المومنین سیدہ خدیجہؓ ہیں۔ امت مسلمہ کا چشمہ کبھی خیر سے خشک نہیں رہا۔ ہم نے موجودہ دور میں اُن مسلمان بیبیوں کی کچھ شاندار مثالیں بھی دیکھی ہیں جنھوں نے طویل برسوں تک صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا جن میں وہ بے شمار مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرتی رہیں' اُن کے شوہر جیل خانوں اور زندانوں میں تھے اور وہ راضی، قانع، خوش اپنی اولاد کی دیکھ ریکھ کررہی تھیں۔ اپنے شوہروں کو اطمینان دلاتیں اور باطل کے ظلم و زیادتی کے بالمقابل حق پر استقامت میں وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ ان میں سے بعض بیبیوں کو قید و بند اور ایذاء وتعذیب کا نشانہ بھی بننا پڑا تو وہ اس پر صبر وتحمل کرتی رہیں اور دعوت کے راستے سے نہ ہٹیں''۔ (دعوت دین کی راہ، ص ۶۷، ۹۱)

مصطفیٰ مشہور ''طریق الدعوۃ'' کے آخری باب میں راہ حق کے مسافروں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اے بھائی! ہم راہ دعوت میں ثابت قدم ہوجائیں۔ ایک بار جمنے کے بعد پھر قدم نہ پھسلے۔ ہم راستہ پر برابر گامزن رہیں، کسی وقت کسی جگہ اور کسی حالت میں بھی چلنے سے نہ اکتائیں۔ چاہے ہم میں سے کوئی زمین کے کتنے ہی دور دراز گوشے میں تنہا ہو یا قید خانوں کی گہرائیوں میں اکیلا رہ

جائے۔ہمیں اللہ کی معیت کا احساس وشعور ہو، کیونکہ وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے۔

اے بھائی! اپنے اِس سفر سے کبھی نہ اکتائیں خواہ آپ کی نگاہوں سے فتح ونصرت کے آثار یا آپ کے اعمال اور جہاد کے نتائج کتنے ہی دور ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور وہ ہم سے صرف ہمارے اعمال اور نیتوں کا حساب لے گا، وہ ہم سے نتائج کی پوچھ گچھ نہیں کرے گا۔

اے بھائی! ہمیں جتنا بھی اذیتوں کا سامنا ہو، جتنا بھی باطل ہمیں ڈرائے دھمکائے ہم بہرحال ثابت قدم رہیں۔ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں بہترین اسوہ ونمونہ ہے۔ہم اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مصداق بن جائیں :

الَّذِيْنَ اسْتَجَابُواْ لِلّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُواْ مِنْهُمْ وَاتَّقَواْ أَجْرٌ عَظِيْمٌ الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُواْ لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَاناً وَقَالُواْ حَسْبُنَا اللّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ o فَانقَلَبُواْ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُواْ رِضْوَانَ اللّهِ وَاللّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيْمٍ o إِنَّمَا ذَالِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءهُ فَلاَ تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران : ۱۷۲-۱۷۵)

''جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا' اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں اُن سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔آخر کار وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہوگیا۔اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔اب تمہیں معلوم ہوگیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم صاحب ایمان ہو''۔ (دعوت دین کی راہ، ص ۲۰۶)

بھارت کے موجودہ حالات میں جب کہ مسلمان بھگوا دہشت گردوں کے ہجومی تشدد (Mob Linching) کا شکار ہورہے ہیں، دین وایمان کی حفاظت، صبر وتحمل اور استقامت کا مظاہرہ کرنا اہل ایمان کے بنیادی مطلوبہ اوصاف میں شامل ہے۔ اگر ہم نے جرأت و ہمت، استقلال اور صبر واستقامت کے ساتھ بحیثیت خیر امت اپنی دعوتی، اصلاحی اور فلاحی سرگرمیوں کو بلاخوف وخطر جاری رکھا تو یقین جانئے شمال سے لے کر جنوب تک گنگا، جمنا، کرشنا، کاویری اور برہمپترا کی وادیوں میں لہراتا یہ زعفرانی پرچم ہمارے بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔صبر واستقامت کو اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے ڈھال بنا کر ہم باطل سے ہر محاذ پر مورچہ لینے کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔ہمیں حافظ جنید، پہلو خان اور اکبر خان کی طرح اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے شہادت کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہونا پسند ہے مگر ہم اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنے نظریات، اور اپنے بنیادی عقائد سے ہرگز دست بردار نہیں ہوسکتے۔

میں مطمئن ہوں اگر چہ خراب ہے ماحول
خزاں کے بعد کا موسم بہار ہوتا ہے

☆☆☆

تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ذمہ داری اٹھانا:

ایک کم عمر بچہ ہے، وہ اپنے کپڑے خود سے نہیں پہن پاتا، لیکن روزانہ صبح سویرے ماں اس سے کہتی ہے کہ وہ اپنے کپڑے پہننا شروع کرے، پھر مسلسل اس کو ڈراتی بھی ہے کہ اگر وہ کپڑے پہننے کی کوشش نہیں کرے گا تو فلاں فلاں چیز سے محروم کردیا جائے گا، جبکہ بالعموم اس طرح کی دھمکیوں سے وہ کسی چیز کو نافذ بھی نہیں کر پاتی، چنانچہ پھر وہ اپنے غصہ کے باوجود جلدی جلدی اس کو کپڑے پہناتی ہے، یہ دراصل اس کے اپنے کام خود نہ انجام دے پانے کے فائدے ہیں جو اس کو ماں خود ہی سکھاتی ہے، کہ ماں اس کو کپڑے بھی پہناتی ہے اور اس طرح وہ ماں کی توجہ اور اس کی عنایت بھی حاصل کر لیتا ہے۔

اس کے بالمقابل ہونا یہ چاہیے کہ ماں کچھ وقت خرچ کرے اور اس کو کپڑے پہننے کی مشق کرائے، اس طرح ماں اس کو باور کرائے گی کہ وہ خود اپنی ذمہ داریاں نہیں اٹھا پا رہا ہے، اور ماں کو یہ بھی نہیں محسوس ہوگا کہ بچہ جہاں تک پہنچا ہے اس کا سبب دراصل وہی بنی ہے۔

۱۲ سال کی ایک بچی سے کوئی بھی یہ امید نہیں کرتا کہ وہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے اور کچھ اپنا حصہ رکھے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ماں کھانا بھی بناتی ہے، دسترخوان بھی صاف کرتی ہے، گھر کی صفائی بھی کرتی ہے اور کپڑے دھوتی اور تہہ کرتی ہے، حتی کہ وہ بچی کے کمرے اور بستر کی بھی صفائی اور ترتیب کرتی ہے، اگر آپ اس سے اس سلسلہ میں پوچھیں تو وہ اپنے عمل کو اس طرح صحیح ٹھہرانے Justify کرنے کی کوشش کرے گی، کہ ''میں اس کو اس سلسلہ میں روکتی نہیں ہوں''، ''لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کا بچپن خراب کروں، اور ان کاموں میں پھنسا کر اس کا بچپن اجیرن کردوں، میں اپنے بچوں سے بہت محبت کرتی ہوں''، ''میں نہیں چاہتی کہ جس طرح میرا بچپن خراب ہوا تھا اسی طرح اس کا بچپن بھی خراب ہو''۔

بظاہر اس ماں کے یہ جذبات بڑے پاکیزہ ہیں مگر جب اس کو پتہ چلے گا کہ اس نے اپنے اس رویہ سے بیٹی کو اس طرح لاچار بنادیا کہ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی ذاتی ذمہ داری بھی نہیں اٹھا سکتی اور ذمہ داریوں کو لے کر بالکل بے پروا ہے، تو زندگی کے اس موڑ پر ہر اسی ماں کو بڑی تکلیف ہوگی۔

ہمیں اپنا بھی جائزہ لینا چاہیے:

مذکورہ بالا سطور میں جو دونوں مثالیں دی گئیں، ان دونوں میں والدین کا جو رول ہے وہ نہایت مخلصانہ ومحبانہ ہے، ان کی نیت بہت اچھی ہے، البتہ ان کو اپنے کاموں میں مزید تفکیر وحکمت اور حقائق کے ادراک کی ضرورت ہے، ان کو جب اپنی توقع اور امید کے خلاف نتائج ملیں تو

قطعاً تعجب نہیں کرنا چاہیے، بلکہ سوچنا چاہیے کہ کوتاہی کہاں ہوئی، چنانچہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ بچوں کی تربیت ذمہ داریاں اٹھانے کی کی جاتی مگر وہ دوسروں پر بھروسہ کرنے اور ذمہ داریوں سے بھاگنے کی ذہنیت کے ساتھ پروان چڑھے، خوب مشاہدہ ہوتا ہے کہ بعض والدین اپنے بچوں کے لیے بڑی قربانیاں دیتے ہیں، خوب کوشش کرتے ہیں، ان کے لیے وقت دیتے ہیں اور خود ہی ان کے اپنے ہاتھ سے انجام پانے والوں کاموں کو بھی کرتے ہیں، مگر کبھی اپنے آپ سے یہ اہم سوال نہیں کرتے ''کس طرح بچہ کی ایسی مدد کی جاسکتی ہے، جس سے اس میں مزید پختگی آئے اور اس میں ذمہ داریاں اٹھانے کی مزید قدرت پیدا ہو؟'' اگر وہ اس سوال کی حقیقت کو سمجھ لیں تو ان کے برتاؤ اور رویّوں میں تبدیلی آجائے گی، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ ذمہ داریاں اٹھانے کی عادت کے ساتھ پروان چڑھے تو ضروری ہے کہ پہلے آپ خود اپنے افکار و افعال اور توقعات و برتاؤ کا جائزہ لیجئے، اللہ کا ارشاد ہے إن اللہ لایغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسهم (رعد:۱۱) (اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات نہیں بدلتے)۔

اس کی مزید وضاحت کے لیے ایک اور مثال دیکھتے ہیں، عام طور پر بچوں اور بچیوں کی تربیت آئندہ زندگی میں ان کے کردار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی جاتی ہے، چنانچہ ہر بچہ اور بچی بحیثیت ایک مرد اور بحیثیت ایک عورت آئندہ زندگی میں اپنے کردار کے متعلق بہت کچھ اپنے والد و والدہ کے برتاؤ سے سیکھ لیتا ہے/ لیتی ہے۔ اس طرح اپنے والدین کی توقعات سے بھی وہ بہت کچھ سیکھتے ہیں، مثلاً تصور کیجئے کہ اس بچے کی تربیت کیسی ہوگی جس سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باورچی خانہ کے کام، گھر کی صفائی اور بچوں کی رعایت کرنے میں ہاتھ بٹائے، یا یہ کہ وہ اپنے والد کو ان سارے کاموں میں شرکت کرتے دیکھتا ہو، یہاں اس بات کے ذکر کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ یہ سارے کام عورتوں کے لیے خاص ہیں، بلکہ دراصل مقصد یہ ہے کہ تربیت و توجیہ کا انداز ان توقعات کی تبدیلی سے بدل جائے گا، اب تو صورت حال یہ ہے کہ خود اسکول میں بعض گھریلو کام جیسے پکانے اور کپڑے پریس کرنے وغیرہ کی تربیت دی جاتی ہے، اس لیے کہ ان کو کاموں کو ضروریات زندگی سمجھا جاتا ہے، اور آئندہ زندگی میں یہ کام خود ہی انجام دینے کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کچھ والدین بعض اوقات یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ ''اب تو بہت دیر ہوگئی اب تبدیلی ممکن نہیں، میں اب کچھ نہیں تبدیل کرسکتا''، لیکن درحقیقت تبدیلی کا امکان کبھی بھی ختم نہیں ہوتا، حالات کتنے ہی سخت اور بدتر کیوں نہ ہوں مگر تبدیلی کا امکان بہرحال باقی رہتا ہے، ارشاد باری ہے وانه يائيس من روح الله الا القوم الكٰفرون (یوسف:۸۷) (اللہ کی رحمت سے کافر لوگ مایوس ہوا کرتے ہیں) اور حدیث نبوی ہے کہ ''اللہ سے مدد چاہو اور عاجز مت ہو''، ظاہر ہے کہ یہ کوئی نظریاتی بات نہیں ہے بلکہ درحقیقت انسانی تجربات کی روشنی میں یہ ایک عملی حقیقت ہے۔

اچھے والدین یا ذمہ دار والدین :

(دوسرا جدول دیکھیے)

اچھی اور بہترین تربیت کی خاطر جن بنیادی امور کا سیکھنا والدین کے لیے ضروری ہے، ان میں سب سے زیادہ بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ صرف اچھے والدین نہ بنیں، بلکہ ذمہ دار والدین بنیں، اچھے والدین کا کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے

کے تمام کام خود ہی انجام دیتے ہیں گویا وہ بچوں کے خدمت گذار بن کر رہتے ہیں، چنانچہ وہ بچے کو کپڑے پہننے کے لیے کہتے ہیں پھر خود ہی پہنا دیتے ہیں، وہ جو کپڑے زمین پر اتار کر ڈال دیتا ہے انھیں اٹھا لیتے ہیں، وہ کھانا کھالے تو اس کی پلیٹ اٹھاتے ہیں، اس کا بستر ٹھیک کرتے ہیں، جب وہ کھانا کھاتا ہے تو اس کی خدمت کے لیے کھڑے رہتے ہیں، دوسروں کے ساتھ اس کے جھگڑوں کو حل کرتے ہیں، بسا اوقات اسکول جاتے وقت اس کا بیگ بھی اٹھاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ والدین محض طیب نفس اور نیک نیتی کے سبب کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ اپنے اس عمل اور طریقہ کار سے بچے کو نقصان پہنچاتے ہیں، کیوں کہ اس طرح اس کی ذمہ داریاں اٹھا کر وہ اسے دوسروں پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کا عادی بناتے ہیں، چنانچہ اگر ابتدائی عمر میں بچے پر ذمہ داری نہ ڈالی جائے اور اسے خود پر اعتماد کے مواقع نہ فراہم نہ کیے جائیں، زندگی سے تجربات حاصل کرنے کی فرصت نہ ملے تو پھر بچہ تردد، بے اعتمادی اور اپنے سلسلہ میں بے یقینی کی نفسیات کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔

اس کا بدل یہ ہے کہ والدین صرف نیک نیت اور اچھے نہ بنیں بلکہ وہ ذمہ دار ہونے کا ثبوت دیں، ذمہ دار والدین کا کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ مساوات اور ایک دوسرے کے احترام والا معاملہ کرتے ہیں، چنانچہ جب بھی بچہ اپنے اختیارات کو صحیح طور پر استعمال کرتا ہے تو وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، پھر وہ بچوں کی ان اختیارات کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے کی تربیت کرتے ہیں، اس کے برخلاف محض نیک نیت والدین بچے کو ان سب چیزوں سے محروم رکھتے ہیں، وہ مساوات و احترام کا رویہ نہیں اپناتے، بلکہ وہ تو خود اپنا بھی احترام باقی نہیں رکھ پاتے، اس لیے کہ وہ خود کو بچوں کا خادم بنا کر رکھتے ہیں، اور بچے ان کے ساتھ کچھ اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں اور ان سے خدمت لیتے رہتے ہیں۔

یہاں اس اہم نکتہ کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں کہ بچوں کی اگر صحیح طور پر تربیت کی جائے تو ان کے اندر ذمہ داری اٹھانے کی بڑی زبردست صلاحیت وطاقت ہوتی ہے، مثلاً سات سالہ بچہ اپنے کپڑے ٹانگ سکتا ہے، بڑی حد تک اپنا بستر بچھا سکتا ہے، کھانے کے بعد اپنی پلیٹ لے جا کر کچن میں رکھ سکتا ہے، اسی طرح بچہ چاہے جس عمر کا ہو اس کے اندر اپنے آپسی جھگڑے حل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، دس سال کی عمر کے بعد وہ الارم گھڑی کا استعمال کر سکتا ہے جو اسے اسکول ٹائم پر متنبہ کرے ورنہ وہ بار بار اسکول جانے میں تاخیر کا شکار ہوگا، ان امور کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ والدین بسا اوقات بچوں کو دوسری ذمہ داریاں بھی سونپ سکتے ہیں۔

ذمہ دار ماں وہ ہوتی ہے جو پختہ عزم رکھتی ہو، البتہ ہر وقت بچے پر مسلط نہ رہتی ہو، وہ بچے کے حقوق کی رعایت کرتی ہو اور اس کی خواہشات کا احترام بھی کرتی ہو، البتہ ہمہ وقت اس کے مطالبات پورے کرنے کے لیے تیار نہ کھڑی رہتی ہو، مثلاً جب بچے کچن میں کھیلنے لگیں اور خوب شور مچانے لگیں تو ماں کے لیے ممکن ہے کہ ان سے کہے ''بچوں معذرت کے ساتھ تمہاری آوازیں بہت تیز ہو رہی ہیں یا تو کچن میں اطمینا سے رہو یا پھر اگر شور ہی کرنا ہے تو گھر سے باہر یا اپنے کمرے میں جا کر شور کرو، بتاؤ تم لوگ کیا کروگے''، اس طریقہ سے بیک وقت ماں نے اپنے حق کی ادائیگی بھی کی اور ان سے کچن میں خاموشی کا مطالبہ بھی کیا، ساتھ ہی بچوں کے حق کا بھی لحاظ رکھا اور انھیں اختیار وانتخاب کی آزادی دی۔

دوسری مثال اس بچے کی ہوسکتی ہے جو گھر میں اپنی بہت سی ضروریات سے لاپروا ہوتا ہے، لاپرواہی میں بہت سی

ضرورت کی چیزوں کو ضائع کرتا ہے مگر اس کو ذرہ برابر افسوس نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کی ماں بڑی نیک نیت اور بہت اچھی ہوتی ہے وہ ہمیشہ اس کے جوتے، کھلونے اور دیگر چیزیں تلاش کر دیتی رہتی ہے، لیکن بچے کے اندر اس ماحول میں اپنی ضروریات کو پورا کرنے اور اپنی ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیات نہیں پیدا ہوتی، اگر اس کو اپنی غفلت اور لاپرواہی کے نتائج جھیلنے کا موقع دیا جائے تو یقیناً وہ اپنی ضروریات کی رعایت کرنا اور ذمہ داری اٹھانا سیکھے گا، اور اس طرح دھیرے دھیرے اس کو اپنے آپ پر اعتماد بھی ہوتا جائے گا، تفکیر وتحلیل اور اپنے اختیار وانتخاب کے حصول کی کوشش میں اس کے اندر موجود صلاحیتیں بھی پروان چڑھیں گی، والدین کی طرف سے یہ ذمہ دارانہ رویہ وطریقہ بحث وتکرار اور بچے کو اختیارات سے منع کرنے کے بالمقابل زیادہ بہتر ہے، بلکہ ڈانٹ ڈپٹ اور جدال کے بالمقابل اس طریقہ سے اس کی حوصلہ افزائی اور تائید ہوگی جو اس کے مستقبل کے لیے بے حد مفید ہوگی۔

مشق و رهنمائی کی ضرورت:

بچے کو ذمہ داری دینے کے سلسلہ میں غلط فہمی کا بھی دخل ہوتا ہے، عام طور پر بچے کو ذمہ داری دینے کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اہل خانہ کام سے بھاگ رہے ہیں، یا یہ کہ اس طرح ان کو توجیہ وتربیت اور تعلیم کی ذمہ داری سے رخصت مل جاتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بچے کو اگر بغیر نگرانی کے زیادہ ذمہ داریاں سونپی گئیں تو اس کو نقصان ہوگا، اس لیے ضروری ہے کہ نگرانی رکھتے ہوئے بتدریج اور مرحلہ وار ذمہ داریاں دی جائیں اور کچھ وقت اس سے متعلق تربیت ورہنمائی کے لیے خاص کیا جائے۔

عام طور پر اہل خانہ بچے کے پرسکون رہنے پر بڑی راحت محسوس کرتے ہیں، خواہ وہ طویل وقت ٹیلی ویژن یا کمپیوٹر گیم میں ہی کیوں نہ مصروف ہوکر گزارے، اس صورت حال میں بچے کی توجہ ان چیزوں سے ہٹانا ضروری ہے، تاکہ اس کو ذمہ داریاں اٹھانے سے متعلق کچھ سیکھایا جاسکے اور دوسری چیزوں میں ان کی توجہ مبذول کی جاسکے، ابتدا میں اس سلسلہ میں دشواری پیش آئے گی، اور بچہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ وہ سرکشی پر آمادہ ہوجائے لیکن رفتہ رفتہ وہ ان نئی مصروفیات خواہ پڑھنے، تصویر بنانے یا رنگ کرنے سے متعلق ہو، ان سے ہم آہنگ ہوجائے گا۔

والدین کے کرنے کا کام یہ ہے کہ بچہ جب بھی کوئی نیا کام شروع کرے یا نئی ذمہ داری اٹھائے تو والدین اس کے پاس رہیں، اس کی حوصلہ افزائی کریں، رہنمائی کریں اور اس سلسلہ میں اس کو ضروری نصیحتیں کریں، اور اگر کبھی عملا تعاون کی ضرورت ہو تو عملی تعاون بھی کریں، لیکن اس کو خود کام انجام دینے کا موقع ضرور دیں خواہ وہ غلطی کرے، رفتہ رفتہ اہل خانہ کو مدد بھی نہیں کرنا پڑے گا، وہ اس کو خود ہی کوششیں کرتے دیکھیں گے، رفتہ رفتہ وہ آگے بڑھے گا اور اپنے آپ پر اس کا اعتماد بحال ہوتا جائے گا، ان کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ جب بچہ کوئی کام کرے تو اس کے قریب رہیں خواہ وہ کوئی آرٹ ہی بنائے، اپنے کپڑے پہننے، اپنے دانت صاف کرے، اپنے بال دھوئے، یا وضو کرے یا سائیکل چلائے، یا کوئی چیز تلاش کرے یا کھانا تیار کرے، مطبخ کے برتن دھوئے یا کمرے میں جھاڑو لگائے، کوئی بھی کام کرے مگر والدین اگر اس کے پہلو میں رہیں گے تو بچے کے اندر مزید شوق پیدا ہوگا۔

نیچے ہم ان اعمال کی فہرست دینے کی کوشش کرتے ہیں جو بچے کی طرف سے اہل خانہ انجام دیتے ہیں، جبکہ یہ کام عمر کے

اعتبار سے اگر بچوں کو موقع دیا جائے تو وہ انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں، والدین کو اس فہرست میں ان امور کی نشاندہی کر لینا چاہیے جن کو بچہ کر سکتا ہے مگر وہ خود ہی انجام دے دیتے ہیں۔

آپ خود ہی دیکھیے کہ کس عمر میں والدین کو ان اعمال کی ذمہ داری بچوں پر ڈالنا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں ہر گھر کا تعامل الگ الگ ہے، بہرحال یہاں نیچے وہ فہرست درج کی جاتی ہے، ملاحظہ کیجئے:

- صبح کو جگانا۔
- بستر اور کمرہ مرتب کرنا
- کپڑے منتخب کرنا اور اگلے دن کے لئے انھیں تیار کرنا۔
- کپڑے پہننا۔
- جوتے اور کپڑے تلاش کرنا۔
- کپڑے خریدتے وقت انھیں پسند (Choice) کرنا۔
- صبح کا ناشتہ اور اسکول کا ٹفن تیار کرنا۔
- زمین پر جو کپڑا گر جائے اس کو اٹھانا اور ٹانگنا۔
- کمرے میں ہر طرف پھیلے ہوئے اپنے کھلونوں کو سمیٹ کر ترتیب سے رکھنا۔
- نہانا، دانت صاف کرنا، منہ دھونا اور بال سلجھانا۔
- جب بچہ کھانا کھائے تو اس کی رہنمائی کرنا۔
- کپڑے تہہ کرنا۔
- کھانے کا دسترخوان بچھانا اور کھانے کے بعد برتن اٹھانا۔
- کچن کے فرش پر پوچھا لگانا، گھر کی دھول جھاڑنا، اور فرش پر جھاڑو لگانا۔
- غسل خانہ کی صفائی و ترتیب کرنا، جنگلوں کے شیشے صاف کرنا۔
- تولیہ سمیٹنا، اس کو تہہ کرنا اور مناسب جگہ رکھنا۔
- دوسروں کے ساتھ جھگڑے کو حل کرنا۔
- مارکیٹ سامان خریدنے جانا یا پوسٹ آفس جانا۔
- اسکول کا ہوم ورک کرنا۔
- گاڑی کو اندر سے دھونا اور مرتب کرنا۔
- گارڈن کی گھاس کاٹنا اور اس کی صفائی و ترتیب کرنا۔
- وضو اور نماز۔
- آری یا ہتوڑی استعمال کرنا۔
- مستقبل یا پڑھائی سے متعلق کوئی منصوبہ اختیار کرنا۔
- روزنہ کی مصروفیات اور روزمرہ کے پروگرام کو مرتب کرنا۔

اس فہرست کو پڑھنے کے بعد ماں باپ کے لئے مفید ہوگا کہ وہ درج ذیل سوالات پر غور کریں:

۱۔ کون سے وہ کام ہیں جن کو ہم انجام دیتے ہیں جبکہ بچے انھیں خود کر سکتے ہیں؟

۲۔ وہ کون سی نئی ذمہ داریاں ہوسکتی ہیں جنھیں آئندہ ہفتہ ہم بچے پر ڈال سکتے ہیں، اور اس طرح ایک نئی شروعات کر سکتے ہیں؟

۳۔ بچے کو ان نئی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرنے کی خاطر ہم کس طرح پروگرام مرتب کریں اور کس طرح مرحلہ واریت کو ترتیب دیں؟

یہاں ہم کچھ مثالیں اور عملی موقف پیش کرتے ہیں:

پہلی مثال:

سمیر: ابا جان کیا آپ مجھے کھیل کے میدان تک پہنچا دیں گے، میرے لیے وہاں دس بجے پہنچنا ضروری ہے (اس وقت دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں)۔

والد: سمیر لگتا ہے کہ یہ تمہاری عادت سی بن گئی ہے، میں اپنے اس کام کو آدھا کر چکا ہوں، درمیان میں چھوڑ کے نہیں جا سکتا، تم نے وقت سے پہلے تیاری کیوں

نہیں کی، تمہارے لیے ممکن تھا کہ تم وقت رہتے اپنے سائیکل سے چلے گئے ہوتے۔

سمیر: میں بھول گیا اور مجھے دھیان نہ رہا، اب اگر آپ نہیں پہنچائیں گے تو میں لیٹ ہوجاؤں گا (اور گویا اب وہ رونا شروع کردے گا) اور بار بار کہے گا، ابا مجھے پہنچا دیجئے۔

والد: اچھا ٹھیک ہے، میں اس بار تم کو پہنچا دیتا ہوں، لیکن آئندہ سے خیال رکھنا اور پہلے سے آئندہ کے لیے تیاری کرنا۔

ہاں! یہ ضروری ہے کہ اہل خانہ بچے کی مدد کے لئے تیار رہیں، بالخصوص اہم کام اور اضطراری صورت حال میں اس کی مدد ضرور کریں، لیکن اگر یہی صورت حال بار بار پیش آئے اور بچہ محض اس لیے غفلت کرے کہ وہ آسانی اور جلدی سے اس کو حل کر لے گا تو پھر اہل خانہ کو نوٹس لینا چاہیے اور اس صورت میں ہاتھ کھینچ لینا چاہیے، تاکہ وہ اپنے امور پر خود دھیان دے، اور اپنے امور کو انجام دینے کے لیے پہلے سے تیار رہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس مثال میں والد اپنے بیٹے کے لیے محض ''اچھے اور نیک نیت والد'' تھے یا پھر ''ذمہ دار والد''؟ ان کے لیے کیا کرنا ممکن تھا کہ جس سے وہ اپنے بیٹے سمیر کے اندر احساس ذمہ داری، تنظیم وترتیب اور پلاننگ کا احساس پیدا کرتے؟۔

دوسری مثال:

والد: لیلیٰ! تم اپنے گندے ہاتھ سے کیوں کھا رہی ہو، تم نامناسب انداز میں لالچیوں کے طریقے سے کھانا منہ میں رکھ رہی ہو، لیلیٰ! تم سن رہی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ جو تم کر رہی ہو، یہ گندہ کام اور معیوب ہے۔ اپنا چمچہ استعمال کرو، اس ہاتھ سے نہیں کھاؤ دوسرا ہاتھ استعمال کرو، پہلے اپنا ہاتھ سیدھا رکھو پھر اطمینان سے منہ تک لے جاؤ۔

دیکھو ذرا کیا ہوا، پورا لقمہ زمین پر گر گیا ہے، (والد بقیہ افراد خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے ہیں) کہ تم میں سے کوئی جا کر کپڑا لائے اور یہ زمین پر جو کھانا گرا ہے اس کو صاف کردے۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح یہ والد اپنی بیٹی لیلیٰ کو ذمہ داری اٹھانے پر حوصلہ افزائی نہیں کر رہے ہیں؟

سوچیے ذرا کس طرح ان کے لیے بیٹی کو کھانے کے آداب، دسترخوان پر بیٹھنے کے آداب سکھانا ممکن تھا؟ اس کے لیے انھیں کیا تدبیر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

تیسری مثال:

ماں: (اپنے ۹ سالہ بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے) حسان یہاں آؤ، اب یہ سونے کا وقت ہے، چلو جلدی آؤ، دیکھو وقت دیکھو، تم جانتے ہو کہ ہر رات میں تم کو اس کے لیے یاد نہیں دلاؤں گی، (پھر دو منٹ بعد) حسان میں نے تم سے کہا کہ یہ سونے کا وقت ہے، چلو جلدی کرو اور جلدی سے دودھ پیو، کیا تم نے برش کر لیا، دانت صاف کر لیے، برش کہاں رکھا؟ تمکو پتہ ہونا چاہیے کہ برش کہاں رکھا جاتا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہر رات میں تم کو تمہارا برش تلاش کر کے دوں گی؟ چلو جلدی آؤ، دیکھو یہ تمہارا برش ہے جلدی سے دانت صاف کرو، میں تمہیں سونے کے کپڑے (Sleeping Dress) دیتی ہوں، کیا بستر پر جانے سے پہلے تم باتھ روم جا کر ضروریات سے فارغ ہوآئے ہو؟

کیا آپ نے محسوس کیا کہ اس مثال میں بھی ماں محض ایک

''اچھی ماں'' نظر آرہی ہے جبکہ اس کو ''ذمہ دار ماں'' کا کردار ادا کرنا چاہیے تھا، اس کے لیے کیا کرنا ممکن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی حوصلہ افزائی کرتی تاکہ وہ ذمہ داری اٹھانا اور اپنے آپ پر اعتماد کرنا سیکھتا۔

اھل خانہ کے لیے ھدایات:

والدین کے لیے یہ مفید ہے کہ اپنے بیٹوں کو کھانا بنانے، سینے ٹانکنے اور پریس کرنے نیز گھر کی صفائی کرنے کی تربیت دیں، گھر کے اکثر کام انجام دینا سکھائیں، جبکہ اپنی بچیوں کو بولٹ ٹائٹ کرنا اور پیچکس کا استعمال کرنا سکھائیں، بجلی کا پنکھا تبدیل کرنا، گارڈن کی گھاس کاٹنا سکھائیں، یہ سب سکھانے میں والدین کا تصرف اور ان کا خود ان کاموں کو انجام دینا اہم سبب ثابت ہوگا۔

ذمہ داری اٹھانے کی تربیت میں اولاد کے لیے سب سے زیادہ مفید یہ ہے کہ والدین انھی ذمہ داری سپرد کریں، چنانچہ ماں خود سے سوال کرے، کہ وہ کون سے کام ہیں جن کو میں انجام دیتی ہوں، مگر انھیں اگر میں بچے کے لیے چھوڑ دوں تو وہ خود انجام دے سکتا ہے، پھر ماں اس کی پلاننگ کرے اور بتدریج اس عمل کو بچے کے انجام دینے کے لیے چھوڑ دے۔

بچوں کو ذمہ داری دینے سے اولاد اور والدین کے درمیان کشیدگی بھی کم ہوگی، اسی طرح والدین پر سے کچھ ذمہ داریوں کا بوجھ بھی کم ہوگا اگرچہ یہ مقصد اصلی نہیں ہے، بلکہ اصلی ہدف تو یہ ہے کہ بچے کی ایک ذمہ دار و معاون اور پُر اعتماد شخص بننے میں مدد کی جائے تاکہ نہ صرف وہ اپنا خیال رکھ سکے بلکہ دوسروں کی بھی دیکھ بھال کر سکے۔

احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے صرف یہ ضروری نہیں کہ انھیں کام دیئے جائیں، مزید درمزید ذمہ داریاں دی جائیں، بلکہ خود فیصلہ لینے کی بھی آزادی دی جائے، پہننے، کھانے اور خریدنے میں انتخاب کی آزادی دی جائے، وقت کیسے گذاریں اس کی آزادی دی جائے، مگر یہ ضروری ہے کہ تربیت و توجیہ کے بغیر ان کو یہ ذمہ داریاں سپرد نہ کی جائیں، یہ کام انجام دینے کے لیے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہیے، ان کو سکھانا چاہیے، بتانا چاہیے، ضروری امور کی تشریح کرنا چاہیے، ان کی مدد کرنا چاہیے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا چاہیے، اور ان کے رویہ کی نگرانی کرتے رہنا چاہیے، اس عمل کو فوراً شروع کرنا چاہیے، اس میں کسی قسم کی سستی اور تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔

والدین کو یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ بچے نئی ذمہ داریاں فوراً اٹھالیں گے، اسی لیے ان کے ساتھ وقت گزارنا انھیں سکھانا بتانا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری ہے، ہمیشہ یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ہر نئے کام کو ان کے سامنے شوق و دلچسپی کا سامان بنا کر پیش کیا جائے، اور بچہ اس کو ایک اہم اور مطلوب عمل کے نظریہ سے دیکھے، جس کو بڑے انجام دیا کرتے ہیں، تسلسل کے ساتھ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے، البتہ کسی کسی وقت پرندے کو چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ خود ہی اپنی قوت بازو سے پرواز کرنے کا تجربہ کرے۔

درج ذیل پانچ مراحل (Step) کا بہت سے والدین بڑا فائدہ محسوس کرتے ہیں:

۱۔ بچے سے پوچھیے وہ کیا کرنا چاہے گا۔

۲۔ اس کو بتایئے کہ وہ فلاں کام کیسے کرے گا۔

۳۔ پھر اس کو چھوڑ دیجئے اور وہ کام اس کو خود ہی کرنے دیجئے۔

۴۔ پھر رفتارِ عمل کی نگرانی رکھیے، کوشش اور مناسب اقدام پر حوصلہ افزائی کیجئے۔

۵۔ تسلسل کے ساتھ سپورٹ کرتے رہیے اور حوصلہ افزائی کرتے رہیے۔

اہل خانہ کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بچوں کو اچھے نمونے کے ذریعہ ذمہ داری اٹھانا سکھائیں، یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ والدین اپنے معیار کے مطابق ذمہ داریاں اٹھا کر دکھائیں، مثلاً کھانے پینے میں نظم وضبط، غیبت وچغل خوری نہ کرنا نہ سننا، استقامت، امانت داری، والدین کی باہمی محبت اور ایک دوسرے کا احترام، پڑوسیوں کی مصلحتوں اور ان کے احساسات کا خیال رکھنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جن کا اولاد کے رویّوں اور کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

یہ بھی نفع بخش طریقہ ہے کہ بچوں کو کچھ رقم بطور جیب خرچ ہفتہ کے حساب سے دی جائے، تاکہ وہ اس ہفتہ واری رقم سے اپنے جیب خرچ کو خرچ کرنے اور اپنی ترجیحات طے کرنے اور اپنا حساب رکھنے کے عادی بنیں۔

ایک ''اچھے باپ'' سے ''ذمہ دار باپ'' میں تبدیل ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ والد اپنے بچوں پر توجہ دینا کم کردے، کیوں کہ والدین کی شفقت، توجہ، گرمجوشی ہمیشہ بچے کے نشو ونما میں اہم شمار ہوتی ہے، مگر توجہ وگرمجوشی کا صرف یہ مطلب نہیں کہ بچے کو چمٹا یا جائے اور بوسے لیے جائیں، بلکہ محبت وشفقت کا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ وقت گزارا جائے اور جب معاملات مشکل و پیچیدہ ہوں تو بھی تسلسل کے ساتھ اس پر توجہ دی جائے، نئے افکار کی تطبیق میں والدین کو مزید محبت وشفقت کا اظہار کرنا چاہیے، صرف رسمی غصہ اور رسمی نرمی سے کام نہیں چلانا چاہیے، مثلاً صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ''تم پر لازم ہے کہ تم نے اپنے دوست سے جو جھگڑا خود شروع کیا ہے اس کو حل کرو''، بلکہ اہل خانہ کو اس کے لیے بچے کے ساتھ بیٹھنا چاہیے اور اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کرنا چاہیے، تاکہ پرامن حل نکالا جاسکے، ورنہ یہی وہ مشکلات ہیں جو بڑھتے بڑھتے انسانی تعلقات کے خاتمہ کا سبب بنتی ہیں، ایسے موقع پر اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ والد اپنے ذاتی تجربات جو انھیں اس صورت حال سے متعلق حاصل ہوئے ہوں وہ بچوں کے سامنے بیان کریں۔

کچھ والدین کے تبصرے:

یہاں ہم کچھ والدین کے تبصرے نقل کرتے ہیں جن سے دیگر اہل خانہ کو مثبت ومنفی استفادہ میں مدد ملے گی۔

☆ میرے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اپنے بیٹے کو پکانا سکھانا چاہیے حتی کہ وہ ۱۲ سال کا ہوگیا، مگر اب وہ اہل خانہ کے لیے ہلکی پھلکی چیزیں تیار کرلیتا ہے، خاص طور پر جس دن اس کے اسکول کی چھٹی ہوتی ہے اس دن وہ یہ کام انجام دیتا ہے، ابتدا میں تو وہ صرف پکانے میں میری مدد کرتا تھا مگر کچھ ہی کوششوں کے بعد میں اس کی معاون بن گئی، اور وہ خود ہی سارا کام کرنے لگا، بلکہ کچھ دنوں کے بعد تو نوبت یہ آئی کہ وہ مجھ سے کہتا ہے کہ آپ گھر کے دوسرے کام دیکھیں، اب تو وہ گھر والوں کے لیے کچھ پکا کر اپنے آپ پر فخر محسوس کرتا ہے۔

☆ میرا ذاتی طور پر یہ خیال ہے کہ یہ سب کام ماں یا باپ کی اولاد کے تئیں ذمہ داریوں میں سے ہیں، میرے بس کی بات نہیں کہ میں بچے کو اسکول کا سارا کام کرتے دیکھوں اور پھر انھیں گھر کے کام میں لگا دوں، آگے بہت زندگی پڑی ہے، اس میں وہ ان گھریلو کاموں کو کرنا سیکھ لیں گے اور تب تک ان کی اسکولی مصروفیت بھی ختم ہوچکی ہوگی، ابھی تو بچوں کے لیے ان کی اپنی اسکولی ذمہ داریاں ہی انھیں تھکا دینے کے لیے کافی ہیں۔

☆ مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے، کہ میرا بیٹا اب تک

سائیکل نہیں چلا پاتا، جب وہ تین سال کا تھا تو میں اس کے ساتھ وقت نہیں گذارتا تھا کہ میں اس کو سکھاتا، میں ہمیشہ اس سے کہتا تھا کہ ''تم ابھی اس کام کے لیے چھوٹے ہو''۔

☆ میری تینوں اولادیں حتی کہ عمر جو ابھی ۹ سال کا ہے، سب کپڑے پریس کر لیتے ہیں اور بہت اچھے طریقہ سے کرتے ہیں، مجھے تعجب ہوتا ہے، میں سوچتی ہوں کہ وہ اس حد تک بہتر کیسے کرنے لگے جس کی مجھے توقع تک نہ تھی۔

☆ میرا بچہ جب چار سال کا تھا تو اس کو ایک گاڑی نے ٹکر ماری، اس کا بچ جانا ایک عجوبہ تھا، میں بہت تعجب میں پڑ جاتی ہوں جب لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتی ہوں کہ بچوں کو ذمہ داریوں دینا چاہیے۔ کیا یہ لوگ اس طرح بچوں کو شدید خطرات میں نہیں ڈال دینا چاہتے ہیں۔

☆ میں اپنی بچیوں کے سارے کام انجام دیتی ہوں، مگر اب میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ بچیوں کو کیسے سکھاؤں؟ وہ اب بڑی ہوگئی ہیں، اور ان کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ دوسرے ہمیشہ ان کی خدمت کے لیے تیار رہیں، ایسی نفسیات اور ایسی عادت کے ساتھ ان کے شوہروں کے ساتھ ان کے تعلقات کس نوعیت کے ہوں گے؟

☆ جب بھی میری بچی اپنے اسکول کے کام میں کوئی پریشانی محسوس کرتی تھی تو میں آسانی سے اس کی مشکل حل کر دیا کرتی تھی اور کبھی اس سے کوئی سوال نہیں کرتی تھی، لیکن اب میں اس کو کیا کرایا حل نہیں بتائی بلکہ اس سے سوال کرتی ہوں تا کہ وہ خود جواب تلاش کرنا سیکھے، یہ صحیح ہے کہ یہ طریقہ طویل المیعاد ہے مگر یہی افضل ہے۔

☆ میں نے کھانے کے انواع واقسام کی ایک فہرست بنالی ہے، اس میں سے روزانہ انتخاب کرنے میں اپنے بچوں کو شریک کرتی ہوں، اس کا نتیجہ بہت مثبت ہے، اور اس سے کھانے کا مسئلہ بالکل حل ہوگیا ہے، سب کے سب ہنسی خوشی اور رغبت سے کھانے میں شریک ہوتے ہیں۔

☆ میں ہمیشہ ان اعمال کی کمیت کو لے کر حیرت میں رہتی ہوں جنھیں بچے انجام دیتے ہیں، اور اس پر بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ بچے کس طرح ہمیشہ ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے مشتاق رہتے ہیں، میرا سات سالہ بیٹا اپنے چھوٹے بھائی کو سونے کے وقت بستر پر لٹاتا ہے، وہ اس پر فخر کرتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں اس پر اعتماد کرتی ہوں، واقعہ یہ ہے کہ اس کے اس تعاون سے مجھے بڑی راحت ملتی ہے بالخصوص دن کے آخری حصہ مین جبکہ میں پورے دن کام کر کے تھک چکی ہوتی ہوں۔

☆ میں اپنی بیٹی کو کھانے کے بعد دسترخوان صاف کرنے میں شریک کرتی ہوں، پھر ہم دونوں ساتھ بات کرتے ہوئے کچن کے برتن دھوتے اور سکھاتے ہیں، اس طرح ہم ایک ساتھ بہت مفید وقت گزارتے ہیں، کام کے دوران کسی سے بات کرنے سے ایک عجیب احساس ہوتا ہے، چنانچہ بسا اوقات کام کے دوران مشکل مقامات پر بھی ہمارے لیے بات کرنا آسان ہوتا ہے جبکہ ہم آمنے سامنے بیٹھے نہیں ہوتے۔

میں اپنے شوہر کی وفات کے بعد کافی تھکن محسوس کرتی تھی، کیوں کہ میری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں، گھر کے سارے کام تھے، تین بچوں کی دیکھ بھال، دن میں گھر کے باہر کے بھی کچھ کام، میرا احساس تھا کہ بچے یوں ہی ماں باپ کے ساتھ نہیں رہنے پاتے، اس لیے میں ان پر ذمہ داریاں ڈال کر مزید ان کی محرومی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی، میں ان کی نیابت میں سارے کام خود ہی انجام دیتی تھی، مگر اب سمجھ میں آیا کہ میرا رویہ درست نہیں تھا، اب محسوس کرتی ہوں کہ اس طریقہ سے میں نے ان پر اور خود اپنے آپ پر کس طرح ظلم کیا ہے۔

دوسرا جدول

والدین کے صحیح رویّہ کے بارے میں بعض لوگوں کا نقطہ نظر		وہ والدین جو ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں	
والدین کا رویّہ یا برتاؤ	**بچوں پر اثرات**	**والدین کا رویّہ یا برتاؤ**	**بچوں پر اثرات**
ہمیشہ بچے پر سوار رہنا، خواہ سزا کے ذریعہ یا معاوضہ کی لالچ دے کر، ہمیشہ اپنے کو حق پر سمجھنا اور بچے سے ہمیشہ اطاعت کی توقع رکھنا اور ان کو ہمیشہ سب سے آگے نکلنے کا پابند بنانا۔	بچہ اس برتاؤ کے نتیجہ میں یا تو مقابلہ آرائی پر آمادہ ہوگا یا پھر سرنیڈر کردے گا، وہ دھوکہ دے گا، جھوٹ بولے گا، نفس پر قابو پانا بالکل نہیں سیکھ سکے گا۔	بچوں کو خود فیصلہ لینے کا موقع دینا، مثبت رویہ اپنانا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا۔	بچے میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور وہ خود فیصلہ لینا سیکھے گا۔
ہمیشہ بچے کے اندر کمال دیکھنا چاہتے ہیں، اس کی غلطیوں کی تاک میں رہتے ہیں، محض پڑوسیوں کی واہ واہی کے لیے بچوں کے حسن سلوک کے خواہاں رہتے ہیں۔	ہمت وعزم کھو دیتا ہے، کیوں کہ وہ وہاں تک نہیں پہنچ پاتا جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے، یعنی امیدوں پر پورا نہیں اترتا، وہ اپنے آپ کو مکمل ظاہر کرتا ہے اور محض دوسروں کو خوش کرنے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔	بچوں کے معمولی سے کام پر بھی خوشی کا اظہار کرتے ہیں، بچے کے آگے بڑھنے اور اس میں زیادہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اس کی خوب حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔	بچے کو اپنی صلاحیتوں پر یقین ہوتا ہے، پھر وہ بدون تردد معاملات کو انجام دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔
بچے پر اعتماد نہیں کرتے، ہمیشہ شک میں مبتلا رہتے ہیں، اس پر سخت ترین قواعد وقوانین فرض کرتے ہیں۔	بچہ احساس گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، اور دوسروں پر بھروسہ نہیں کرتا۔	اپنے بچوں پر بھروسہ کرتے ہیں، ان کی ہر کوشش کو دیکھ کر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔	بچہ آزادی محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ پر اعتماد کرتا ہے، ساتھ ہی دوسروں پر اعتماد کرنا سیکھتا ہے۔
بچوں کی ذمہ داریاں خود ہی اٹھاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بچوں پر بڑی شفقت کر رہے ہیں، ان کی حمایت و رہنمائی میں بڑا مبالغہ کرتے ہیں۔	بچہ عجز وکمزوری کے احساس کا شکار ہوجاتا ہے، پھر وہ اس امید میں رہتا ہے کہ جو اس کا کام ہے اسے کوئی دوسرا ہی انجام دے دے۔	بچے کا احترام کرتے ہیں اور ذمہ داری اٹھانے پر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔	بچہ خود اپنا احترام کرنا سیکھتا ہے، ذمہ داری اٹھانے پر اچھی طرح قادر ہوتا ہے۔
کبھی انکار نہیں کرتے، بلکہ ''نہیں'' کہنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے، ہمیشہ بچے کی ہر خواہش پوری کرتے ہیں، گویا حقیقت میں بچہ ہی ذمہ دار ہے، کہ اس کی ہر بات تسلیم کی جائے۔	بچہ اپنے معاملات کو انجام دینے میں تساہلی کا شکار ہوتا ہے، اس میں مطلب پرستی اور بخل پیدا ہوتا ہے، دوسروں کے ساتھ تعلقات بنانے اور دوستی کرنے کی اس کے اندر صلاحیت نہیں پیدا ہو پاتی۔	دانشمند ہوتے ہیں، خود اپنے اور اپنے بچے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں، تعاون اور مشترک عمل پر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔	بچہ دوسروں کے ساتھ گھلنا ملنا اور تعاون کرنا سیکھتا ہے، اور آسانی سے دوسروں سے تعلقات بناتا ہے، دوستی کرتا ہے۔

☆☆☆

□ انکار حدیث

امام ابوحنیفہ اوران کے اجتہادی اصول (آخری قسط)

تحریر: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم
تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

کیا امام ابو حنیفہ حدیث پر رائے کو ترجیح دیتے تھے ؟:

پیچھے گذر چکا ہے کہ امام صاحب حدیث صحیح کے مقابلہ میں رائے، قیاس اور استحسان میں سے کسی کو بھی ملحوظ خاطر نہ رکھتے تھے، ابن ابی العوام نے اپنی سند سے امام ابو یوسف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''امام ابوحنیفہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس اس سلسلہ میں کوئی اثر مروی ہے، پھر جب ہم پیش کرتے اور خود آپ بھی پیش کرتے تو جس قول کے بارے میں زیادہ اثر مروی ہوتے اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے، اور اگر دونوں قولوں کے بارے میں برابر آثار ہوتے تو غور کر کے کسی ایک کو اختیار فرماتے۔

موفق خوارزمی نے ''العالم والمتعلم'' میں اپنی سند کے ساتھ ابومقاتل حفص بن مسلم سمرقندی سے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: ''ہر وہ بات جو حضور پاک علیہ السلام نے ارشاد فرمائی خواہ ہم نے سنی ہو یا نہ سنی ہو، ہمارے سر آنکھوں پر ہے، ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہی صحیح ہے''۔

ابن عبدالبر نے ''الانتقاء'' میں امام صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالی اس پر لعنت بھیجے جو حضور پاک علیہ السلام کی مخالفت کرے، آپ کے طفیل تو ہمیں یہ عزت ملی اور ہلاکت سے نجات نصیب ہوئی۔

بیہقی نے المدخل میں عبداللہ بن مبارک کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ میں نے ابوحنیفہ کو کہتے ہوئے سنا: ''حضور پاک علیہ السلام سے منقول ہر بات سر آنکھوں پر ہے، اور صحابہ کرام میں جس کے قول کو چاہیں گے ہم اختیار کریں گے، اور اگر کوئی بات تابعین سے مروی ہوگی تو ہم بھی ان ہی کی طرح رائے اور اجتہاد سے کام لیں گے اور ان سے مزاحمت کریں گے''۔

شعرانی ''المیزان'' میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ کی قسم جس نے کہا کہ ہم نص پر قیاس کو ترجیح دیتے ہیں اس نے جھوٹ کہا اور افترا سے کام لیا، کیا نص کے ہوتے ہوئے بھی قیاس کی ضرورت ہے؟ اور یہ کہ ''ہم قیاس بہت ہی شدید ضرورت کے موقع پر کرتے ہیں، مسئلہ کی دلیل ہم پہلے کتاب اللہ سے لیتے ہیں، پھر حدیث سے، پھر صحابہ کرام کے فتاوی سے، اور جس پر صحابہ کا اتفاق ہوتا ہے ہم اس پر عمل کرتے ہیں، اور جس میں ان کا اختلاف ہوتا ہے تو دونوں مختلف فیہ مسئلوں کے درمیان علت کو

سامنے رکھ کر ایک حکم کو دوسرے حکم پر قیاس کرتے ہیں یہاں تک کہ معنی واضح ہو جائیں''۔

امام محمد نے ''المبسوط'' میں خبر آحاد پر عمل کرنے کے سلسلہ میں ایک فصل قائم کی ہے، اور اس پر آپ ﷺ کے واقعات اور صحابہ کے عمل سے استدلال کیا ہے، امام شافعی نے بھی اسے الرسالہ میں بیان کیا ہے۔

یہ تو ان میں سے چند عبارتیں تھیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ صحیح حدیث پر کسی بھی رائے کو ترجیح نہ دیا کرتے تھے، بلکہ ابن حزم نے تو فقہاء عراق سے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ حدیث ضعیف کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔

ابن قیم نے ''اعلام الموقعین'' میں لکھا ہے ''اصحاب ابو حنیفہ سب متفق ہیں کہ امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث قیاس اور رائے سے بہتر ہے، اسی نظریہ پر امام صاحب نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے، چنانچہ قہقہہ کی ضعیف حدیث کو، سفر میں نبیذ تمر سے وضو کرنے کی اجازت بیان کرنے والی ضعیف حدیث کو قیاس اور رائے پر ترجیح دی، دس درہم سے کم چوری کرنے والے پر حد سرقہ جاری نہیں ہونے کا حکم بتایا، جبکہ اس کی بنیاد جس حدیث پر ہے وہ بھی ضعیف ہے، اسی طرح حیض کی اکثر مدت دس دن قرار دی جب کہ اس کے سلسلہ میں بھی حدیث ضعیف ہے، جمعہ شہر میں پڑھا جائے گا اس مسئلہ کی بنیاد بھی ضعیف حدیث پر ہے، کنویں کے مسائل میں غیر مرفوع آثار کی وجہ سے قیاس کو چھوڑا، لہذا امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث اور آثار صحابہ کو قیاس پر ترجیح حاصل ہوگی، یہی مسلک امام احمد کا ہے، لیکن سلف اور متأخرین کے یہاں ضعیف کی اصطلاح میں فرق ہے، چنانچہ بسا اوقات متاخرین کے یہاں کوئی حدیث حسن ہوتی ہے لیکن سلف کے نزدیک وہ ضعیف ہوتی ہے'' (کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ اسی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ کوئی حدیث محدثین کے نزدیک (متقدمین کے اصطلاح کے مطابق ہی سہی) ضعیف ہو لیکن امام صاحب کے نزدیک وہ صحیح ہو، اور ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث کسی امام کے نزدیک صحیح ہو جب کہ وہی حدیث دوسرے کے نزدیک ضعیف ہو۔

بہر حال کچھ بھی ہو جب ابن حزم اور ابن قیم جیسے حضرات جو حنفیہ کا سب سے زیادہ رد کرتے ہیں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ امام صاحب کا مسلک ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دینے کا ہے تو پھر اور کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے، ہاں پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہ ثقہ راویوں کی مراسیل بھی قبول کرتے ہیں جبکہ امام شافعی انھیں کچھ شرطوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور محدثین بالکل ہی رد کر دیتے ہیں، مراسیل کے بارے میں امام صاحب کا نقطہ نظر اس بات کی دلیل ہے کہ آپ قیاس سے اسی وقت کام لیتے ہیں جب کوئی چارہ کار نہیں بچتا ہے۔

ایک اعتراض: خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں چند راویوں کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے امام ابو حنیفہ کے سامنے چند احادیث پیش کیں لیکن امام صاحب نے انھیں قبول نہیں کیا، یوسف بن اسباط نے نقل کیا ہے کہ ابو حنیفہ نے حضور پاک علیہ السلام کی چار سو سے زیادہ حدیث رد کر دیں، (لیکن اس کے باوجود خطیب نے صرف چار ہی روایات پیش کی ہیں) وکیع کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ہم نے ابو حنیفہ کو دو سو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھا، اور حماد بن مسلم کا قول ہے کہ ابو حنیفہ نے ''آثار و سنن'' کو دیکھا

اور پھر انھیں رد کیا۔

یہ اقوال اسنادی حیثیت سے صحیح نہ بھی ہوں تب بھی اتنا تو بہرحال ثابت ہوتا ہی ہے کہ بعض محدثین نے آپ پر نقد کیا تھا اس وجہ سے کہ آپ نے کچھ ایسی حدیثوں کو رد کر دیا تھا جو ان محدثین کے نزدیک صحیح تھیں۔ اور خود ابن ابی شیبہ کا قول گزر چکا ہے کہ ابوحنیفہ نے ۱۲۵ حدیثوں کی مخالفت کی حالانکہ خود امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا قول ہے کہ حضور پاک علیہ السلام کی ہر بات سر آنکھوں پر۔ پھر ایسا کیوں؟

جواب:۱۔ حدیث کی تصحیح وتضعیف میں نقطہائے نظر مختلف فیہ ہو سکتے ہیں، امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو راوی ثقہ ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے نزدیک ضعیف ہو، امام صاحب اپنے شیوخ کے بارے میں بعد والوں سے زیادہ جاننے والے تھے، کیونکہ آپ کا زمانہ ان سے قدیم ہے، اکثر وبیشتر آپ کے اور صحابی کے درمیان صرف دو ہی واسطے ہوتے ہیں، ان دونوں کے بارے میں آپ زیادہ چھان بین کر سکتے ہیں بمقابلہ بعد والوں کے، اور جہاں تک ان راویوں کی بات ہے جو حجاز وشام کے تھے اور آپ کے شیوخ نہیں تھے تو زیادہ تر آپ ان کے بارے میں توقف کرتے ہیں، اور کبھی ان کے بارے میں آپ کی رائے آپ کے تلامذہ کی رائے سے جدا ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے آپ نے بہت سی ایسی حدیثوں پر عمل نہیں کیا جو دوسروں کے نزدیک صحیح تھیں جیسے بہت سے حضرات نے ان حدیثوں کو قبول نہیں کیا جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک صحیح تھیں۔

۲۔ بسا اوقات صحیح حدیث میں ہی مجتہد کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظاہر حدیث کو چھوڑ کر کسی دوسری دلیل کی بنیاد پر کوئی اور رائے قائم کرتا ہے، مثلاً اس میں کوئی خفیہ علت ہو، یا اس مجتہد کے نزدیک کوئی دوسری دلیل اس سے زیادہ قوی ہو، یا وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس میں راوی سے وہم ہوا ہے یا وہ اسے منسوخ سمجھے، یا اس کے عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید کر دیتا ہے، ان تمام اسباب کی وجہ سے وہ اس حدیث پر عمل نہیں کرتا اور محدث اسی کو ترک عمل کا نام دے دیتا ہے، لیث بن سعد نے ستر حدیثیں شمار کرائی ہیں جو صحیح ہیں اور امام مالک نے ان پر عمل نہیں کیا ہے، یہ سب حدیثیں مؤطا میں ہیں۔

تقریباً ہر امام کے بارے میں یہ بات ہے کہ اس نے کچھ دوسرے دلائل کی وجہ سے بعض صحیح حدیثوں کو قبول نہیں کیا ہے، لیکن اس موقف کو اور اس میں چھپے راز کو ایک محدث محض نہیں سمجھ سکتا، محدث اور فقیہ کے درمیان یہی فرق ہے۔

ابن عبد البر نے امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف سے ایک واقعہ نقل کیا ہے، اس سے یہ بات بڑی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے، ابو یوسف فرماتے ہیں: ''امام اعمشؒ نے مجھ سے ایک مسئلہ کے بارے میں سوال کیا، اس وقت ہم دونوں کے علاوہ تیسرا نہ تھا، میں نے مسئلہ کا جواب بتا دیا، انھوں نے مجھ سے پوچھا: یہ تم نے کہاں سے لیا؟ میں نے جواب دیا، اسی حدیث سے نکالا جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی، میں نے وہ حدیث سنائی، کہنے لگے: اے یعقوب! یہ حدیث مجھے تمہاری پیدائش سے بھی پہلے یاد ہے، مگر اس کا مطلب ابھی سمجھا ہوں''۔

ابن عبد البر نے ہی عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا ہے کہ ''میں امام اعمش کی مجلس میں تھا، ایک صاحب آئے جن سے اعمش نے کوئی مسئلہ پوچھا تھا، وہ جواب نہ دے سکے، پھر ابوحنیفہ نظر آئے تو ان سے پوچھا، آپ نے جواب دیا، کہنے لگے کہ کہاں

سے یہ جواب آپ نے نکالا؟ آپ نے کہا کہ اس حدیث سے جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی، تو امام اعمش نے کہا کہ ہم دوافروش ہیں اور تم طبیب ہو''۔

۳۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ امام صاحب سے کچھ حدیثیں مخفی رہ گئی ہوں، ایسا بالکل ممکن ہے کیونکہ صحابہ کرام مختلف شہروں اور ملکوں میں بکھر گئے تھے، اور بعض حدیثیں ایسی بھی تھیں جو ایک جگہ تھیں، لیکن دوسری جگہ نہیں تھیں، اور صحابہ وتابعین میں سے کسی نے یہ دعوی بھی نہیں کیا کہ اس نے کل احادیث کا احاطہ کرلیا ہے، ایک دن شعبی سے کسی نوجوان نے کوئی روایت بیان کی، شعبی نے کہا کہ میں نے تو یہ روایت کبھی نہیں سنی، اس نوجوان نے پوچھا کہ کیا آپ نے کل حدیثیں سن رکھی ہیں؟ کہنے لگے نہیں تو، پھر اس نے پوچھا کہ کیا آدھی؟ انہوں نے کہا نہیں، آدھی بھی نہیں، اس نوجوان نے کہا کہ یہ حدیث اس نصف حصہ میں سے ہے جو آپ نے نہیں سنا''۔

یہ تو تابعی کی بات ہوئی خود بہت سے صحابہ سے بہت سی حدیثیں پوشیدہ رہیں، حضرت عمر سے مجوسی پر جزیہ عاید کرنے اور'' وباء'' والی حدیث مخفی رہی، عبدالرحمٰن بن عوف نے اس کے بارے میں بتایا، اسی طرح آپ الاستیذان والی روایت سے بھی ناواقف رہے، ابوموسی اشعری نے آپ کو بتایا، حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود تک تیمّم کی حدیث نہ پہنچ سکی، جو کہ حضرت عمار وغیرہ کو معلوم تھی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے مسح علی الخفین کی حدیث پوشیدہ رہی، جو حضرت علیؓ اور حضرت حذیفہؓ کو معلوم تھی، اس طرح کی بہت سی احادیث بعض صحابہ سے مخفی رہیں، لیکن کسی نے بھی ان حضرات کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ حدیث سے جاہل تھے، بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی نے کوئی فیصلہ حدیث کے خلاف کردیا کیونکہ اسے اس حدیث کا علم نہیں تھا، معلوم ہونے پر پھر رجوع کیا، لہذا امام ابوحنیفہ کو بھی اس موقع پر معذور سمجھنا چاہیے۔

۴۔ امام صاحب کے زمانے میں حدیث میں جھوٹ بولنا عام ہوچلا تھا، جس کی وجہ سے آپ نے حدیث قبول کرنے میں بڑے سخت اور کڑے شرائط لگائے، جیسے:

(۱) شریعت کے مصادر کے گہرے مطالعے اور استقراء کے بعد آپ نے کچھ اصول متعین کیے تھے، خبر آحاد کو قبول کرنے کی آپ نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ ان اصولوں سے ٹکراتی نہ ہو۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو آپ نے خبر آحاد کو شاذ سمجھ کر ترک کردیا، اور اس اصول کو قوی تر سمجھتے ہوئے اس پر عمل کیا۔

(۲) خبر آحاد کتاب اللہ کے عموم اور ظاہر کے مخالف نہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو آپ خبر آحاد کو ترک کردیتے، الا یہ کہ اس سے قرآن کے مجمل کی تفسیر یا کسی نئے حکم کا ثبوت ہورہا ہو تو اس پر عمل کرتے۔

(۳) حدیثِ مشہور کے مخالف نہ ہو۔

(۴) اس جیسی دوسری خبر آحاد کے معارض نہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو کسی وجہ ترجیح کی وجہ سے آپ کسی ایک کو ترجیح دیتے، وجوہات ترجیح میں اس طرح کی چیزیں تھیں کہ مثلا ایک روایت کا صحابی دوسرے صحابی سے فقاہت میں بڑھا ہوا ہو یا ایک فقیہ ہو اور دوسرا فقیہ نہ ہو یا ایک جوان ہو اور دوسرا بوڑھا۔

(۵) خود راوی کا عمل اس روایت کے خلاف نہ ہو، اسی وجہ سے آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کو قبول نہ کیا کہ اگر کتا برتن چاٹ لے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے، کیونکہ خود حضرت ابو ہریرہؓ کا فتوی اس روایت کے

خلاف ہے۔

(۶) کوئی روایت کسی اضافہ میں منفرد نہ ہو چاہے یہ اضافہ متن میں ہو یا سند میں، اگر ایسا ہوتا تو آپ اس روایت پر عمل کرتے جو اس زیادتی سے خالی ہوتی، ایسا احتیاط کی وجہ سے کرتے۔

(۷) وہ خبر آحاد ایسی بات پر دلالت نہ کر رہی ہو جو عمومِ بلوی کی قبیل سے ہو، اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ بات مشہور ومتواتر ہوتی۔

(۸) وہ روایت ایسی نہ ہو کہ صحابہ میں اختلاف کے موقع پر کسی نے اس سے احتجاج نہ کیا ہو، کیونکہ اگر وہ روایت ثابت ہوتی، تو کوئی نہ کوئی صحابی اس سے احتجاج ضرور کرتا۔

(۹) سلف میں سے کسی نے پہلے اس روایت پر طعن نہ کیا ہو۔

(۱۰) حدود وعقوبات کے سلسلے میں جو مختلف روایات وارد ہوتیں، ان میں سے آپ اس روایت کو لیتے، جس میں ہلکی سزا کا ذکر ہوتا۔

(۱۱) روایت کے تحمل کے وقت سے اسے بیان کرنے تک راوی کے حافظہ میں کوئی خلل نہ واقع ہوا ہو۔

(۱۲) وہ روایت ایسی نہ ہو جو صحابہ وتابعین کے متفقہ عمل کے خلاف ہو۔

(۱۳) راوی اپنی روایت کو یاد کیے بغیر صرف تحریر پر بھروسہ نہ کرتا ہو۔

یہ وہ کچھ اہم شرائط ہیں جو امام صاحب نے خبر آحاد کے قبول کرنے کے لیے لگائی ہیں، محدثین ان میں سے اکثر کو اور ائمہ فقہاء ان میں سے بعض کو قبول نہیں کرتے ہیں، اور اس وقت ہم اس سلسلے میں امام صاحب کی رائے کا دفاع کرنا بھی نہیں چاہتے، ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امام صاحب نے جن خبر آحاد پر عمل نہیں کیا اس میں وہ معذور ہیں۔

الغرض اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ امام صاحب نے ایسا اجتہاد کے پیش نظر کیا جیسا کہ آپ سے پہلے اور آپ کے بعد دوسرے بہت سے ائمہ نے کیا، تب تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر کوئی یہ الزام لگاتا ہے کہ امام صاحب نے ایسا خواہش نفس اور اتباع ہوی کے لیے کیا تو خدا کی پناہ! کہ امام صاحب جیسے متقی پرہیزگار کے بارے میں کوئی ایسا تصور بھی کرے۔

احادیث کے بارے میں امام صاحب کے نقطۂ نظر کی چند مثالیں:

۱۔ دار الخیاطین میں امام ابوحنیفہ کی امام اوزاعی سے ملاقات ہوئی، امام اوزاعی نے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ رکوع اور رکوع سے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ امام صاحب نے جواب دیا، کہ اس سلسلے میں کوئی صحیح روایت آپ ﷺ سے موجود نہیں ہے، امام اوزاعی نے کہا، کیوں نہیں، ایک صحیح روایت ہے۔

پھر امام اوزاعی نے زہری عن سالم عن أبیہ کی سند سے یہ روایت پیش کی کہ حضور ﷺ نماز شروع کرتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے، اس کے جواب میں امام صاحب نے حماد عن ابراہیم عن علقمہ وأسود عن عبداللہ بن مسعود کی سند سے یہ روایت بیان کی کہ حضور ﷺ صرف نماز شروع کرتے وقت ہی رفع یدین کرتے تھے۔

امام اوزاعی کہنے لگے کہ میں آپ کو زہری عن سالم عن أبیہ عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے روایت بیان کرتا ہوں، اور آپ حماد عن ابراہیم کے حوالہ سے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ حماد زہری سے زیادہ فقیہ ہیں، ابراہیم سالم سے فقاہت میں

بڑھے ہوئے ہیں اور علقمہ بھی فقاہت میں حضرت ابن عمر سے کم نہیں، اور ابن عمر کو صحبت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ علقمہ فقاہت میں حضرت ابن عمر سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر امام اوزاعی خاموش ہو گئے۔

۲۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے امام صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ یہ فتوی دیتے ہیں کہ دو معاملہ کرنے والوں کو خیار حاصل نہیں ہوگا جب وہ ایک بیع سے دوسرے بیع میں لگ جائیں اگر چہ ایک ہی جگہ رہیں، تو امام صاحب نے کہا کہ ہاں ،حضرت سفیان نے کہا کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ حضور پاک علیہ السلام سے صحیح حدیث مروی ہے کہ بائع اور مشتری کو اس وقت تک خیار حاصل ہوگا جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں، امام صاحب نے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ اگر وہ دونوں کسی کشتی میں یا کسی جیل میں یا کسی سفر میں ہوں تو کس طرح جدا ہوں گے؟ اور کیا ان کو اختیار حاصل ہوگا؟

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس جگہ امام صاحب نے حدیث کا انکار نہیں کیا بلکہ حدیث سے بدن کی جدائیگی کی جگہ گفتگو کی جدائیگی مراد لی۔

سرسری نظر سے دیکھنے والا سمجھے گا کہ امام صاحب نے حدیث کی مخالفت کی ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو حقیقت کھلے گی کہ امام صاحبؒ نے تو حدیث کا صحیح مفہوم بتایا ہے۔

۳۔ ابن ابی شیبہ نے جو ایک سو پچیس حدیثیں پیش کی ہیں جن میں ان کے خیال کے مطابق امام ابو حنیفہ نے اپنی رائے کو ترجیح دی ہے، ان میں ایک حدیث یہ ہے کہ محمد بن نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ ان کے والد نعمان نے انہیں ایک غلام ہبہ کیا، پھر حضور پاک علیہ السلام کے پاس آئے تا کہ آپ کو گواہ بنا سکیں، آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی سب اولاد کو غلام ہبہ کیا ہے، انہوں نے کہا کہ نہیں ؛ تو آپ نے فرمایا کہ پھر اسے بھی واپس لے لو۔ ابن ابی شیبہ نے اس روایت کے دو طریق اور بھی ذکر کیے ہیں جن میں الفاظ کا کچھ اختلاف ہے۔

اس میں امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے کہ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ہدیہ اور عطیہ اپنی سب اولاد کو برابر دینا چاہئے اور حدیث کے الفاظ سے اس کا وجوب ثابت ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے، اور اس طرح حدیث کو چھوڑ دیا ہے:

علامہ کوثری کے الفاظ میں جو انہوں نے ''النکت الطریقہ'' میں کہا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ: ''روایتوں کے الفاظ مختلف ہیں ، کسی نے استحباب پر محمول کیا اور کسی نے وجوب پر ، استحباب مراد لینے والوں میں امام ابو حنیفہ منفرد نہیں بلکہ جمہور آپ کے ساتھ ہیں، جن میں امام مالک، لیث بن سعد، ثوری، امام شافعی وغیرہ حضرات شامل ہیں، وجوب مراد لینے والوں میں ابن مبارک ، امام احمد اور ظاہریہ ہیں ۔بیہقی نے دس وجوہات ذکر کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اولاد کو ہدیہ میں برابر سمجھنے کا حکم استحباب پر محمول ہے ،قاضی عیاض کی بھی یہی رائے ہے۔ یہاں امام ابو حنیفہ کی طرف سے زیادہ دفاع کرنے کی بھی ضرورت نہیں ، کیونکہ اس مسئلہ میں آپ منفرد نہیں بلکہ جمہور فقہاء آپ کے ساتھ ہیں، اور اس مسلک کی تائید صحابہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے چنانچہ امام شافعی کی صراحت کے مطابق حضرت ابو بکر نے حضرت عائشہ کو اور حضرت عمر نے حضرت عاصم کو عطیہ دیا اور دیگر اولاد کو ان سے کم دیا۔

اسی طرح کی روایات پیش کر کے ابن ابی شیبہ نے امام ابو

حنیفہ پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے، جس کی حقیقت گزر چکی ہے، یہ بھی جاننا بہتر ہوگا کہ جن مسائل میں امام ابوحنیفہ پر حدیث کی مخالفت کا ابن ابی شیبہ نے الزام لگایا ہے ان میں اکثر مسائل میں امام صاحب منفرد نہیں ہیں بلکہ کوئی نہ کوئی دوسرا امام بلکہ بعض مسائل میں چند ائمہ آپ کے ہم خیال ہیں۔

امام ابو حنیفہ کا علمی حلقہ :

امام ابوحنیفہ کا اجتہاد واستنباط کے سلسلہ میں جو طرز عمل تھا اسے ذہن میں رکھ کر مذکورہ بالا طعن درست ہو ہی نہیں سکتے، ابن ابی العوام نے ذکر کیا ہے کہ مغیرہ بن حمزہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے جن شاگردوں نے کتابیں یعنی مسائل مدون کیے وہ چالیس تھے، جو ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اور ان دس لوگوں میں جو زیادہ خاص تھے ابو یوسف، زفر، داؤد طائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد، یحیی بن زکریا وغیرہ تھے، یہ یحیی وہی ہیں جو تیس سال تک مسائل لکھتے رہے۔

ابن ابی العوام نے اسد بن فرات کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب کس مسئلے کے جواب میں اختلاف کرتے اور ہر ایک اپنا جواب پیش کرتا، پھر امام صاحب اپنا جواب پیش کرتے، پھر تین دن انتظار کرتے اور پھر اس کے بعد جو زیادہ مناسب ہوتا، اسے رجسٹر میں نوٹ کر لیتے۔

یحیی بن معین نے ''معرفۃ التاریخ والعلل'' میں فضل بن دکین سے نقل کیا ہے کہ میں نے زفر کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم امام ابوحنیفہ کے پاس آتے تھے اور ہمارے ساتھ ابو یوسف اور محمد بھی ہوتے، اور آپ کی رائے ہم لکھ لیا کرتے، تو ایک دن امام صاحب نے ابو یوسف سے کہا کہ سب کچھ مت لکھا کرو، کیونکہ میری رائے بدلتی رہتی ہے۔

موفق مکی نے کتنا سچ کہا ہے اور اوپر ذکر کردہ تفصیل سے اس کی حقیقت مزید آشکار ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسلک شورائی ہے، آپ نے تن تنہا اجتہاد نہیں کیا بلکہ پوری ٹیم کی اجتہادی کوششوں سے یہ مسلک وجود میں آیا۔

خطیب بغدادی نے کیا خوب لطیفہ بیان کیا ہے کہ ابن کرام کہتے ہیں: ''ایک دن ہم وکیع کے پاس تھے تو ایک شخص نے کہا کہ ابوحنیفہ نے غلطی کی۔ وکیع کہنے لگے کہ ابوحنیفہ کیسے غلطی کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ابو یوسف اور زفر جیسے قیاس کے ماہرین، یحیی بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان اور مندل جیسے حفاظ حدیث قاسم بن معن جیسے ماہرین زبان اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و پرہیز گار موجود ہیں، اگر ان سے غلطی ہوگی تو یہ حضرت ٹوک دیں گے''۔

وکیع کی اس بات سے اتفاق ضروری نہیں کہ ابوحنیفہ غلطی نہیں کر سکتے، لیکن اس میں کیا شک ہے کہ امام ابوحنیفہ جیسے امام جن کے پاس اتنے عظیم شاگرد ہوں، جن کا زمانہ صحابہ سے قریب ہو اور جن کو اللہ رب العزت نے ذہن رسا اور مجتہدانہ عقل عطا کی ہو، ان پر اس طرح کے الزامات لگانا سراسر ظلم وزیادتی ہے، جن کا سلسلہ آپ کے زمانہ سے شروع ہوا اور فتنہ خلق قرآن کے دربار میں انتہا کو پہنچ گیا، اور یہ سب انتقاماً ہوا، اس لیے کہ معتزلہ زیادہ تر امام صاحب کے مسلک کے ماننے والے تھے اور انہوں نے محدثین پر طرح طرح سے ظلم کیے تھے، بدلہ میں محدثین نے امام ابوحنیفہ پر ہی اس طرح کے الزامات لگانا شروع کر دئے، خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ: ''ابوحنیفہ، ابو یوسفؒ، محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے دوسرے شاگردوں میں سے کسی نے بھی قرآن کے بارے میں (اپنی رائے سے) کلام نہیں کیا، قرآن میں کلام تو بشر

مریسی اور ابن ابی داؤد نے کیا، اور انہی لوگوں نے اصحاب ابو حنیفہ پر عیب زنی کی''۔

انصاف کی بات :

جی چاہتا ہے کہ یہاں آ کر حافظ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم'' میں جو کچھ لکھا ہے اسے پیش کردوں۔

محدثین نے ابوحنیفہ کی مذمت میں حد سے تجاوز کیا ہے، اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ ابوحنیفہ اخبار وآثار پر قیاس اور رائے کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ اکثر اہل علم کا ماننا یہ تھا کہ حدیث کی موجودگی میں قیاس کوئی چیز نہیں، لیکن آپ جن اخبار وروایات کو رد کرتے تھے ان کی کچھ تاویل کرتے تھے، اور بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ جو آپ کی رائے تھی وہی اس مسئلہ میں پہلے بعض متقدمین کی رائے تھی، اور پھر آپ کی رائے منفرد نہیں ہوتی تھی، جبکہ دوسرے اصحاب رائے بھی آپ کے موافق ہوتے تھے، آپ کے اکثر اقوال ایسے ہیں جو ابراہیم نخعی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کی آراء سے موافقت کرتے ہیں، ہاں یہ بات ہے کہ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے نوازل اور فرضی مسائل میں قیاس واستحسان سے خوب کام لیا اور ان کے جوابات دیے، جس کی وجہ سے سلف سے بڑا اختلاف ہوا، جسے ان لوگوں نے بدعت سمجھا، (یہ ابن عبدالبر کی ذاتی رائے ہے) اور کوئی بھی ایسا صاحب علم نہیں ہے جس نے کسی بھی حدیث کی تاویل نہ کی ہو، اور کسی روایت کی وجہ سے دوسری روایت کو ترک نہ کیا ہو، مگر ابوحنیفہ کے یہاں یہ چیز زیادہ ہے اور دوسروں کے یہاں کم (یہ ابن عبدالبر کی ذاتی رائے ہے)''۔

لیث بن مسعود کے مطابق امام مالک نے جن احادیث کی مخالفت کی ہے انہیں شمار کرانے کے بعد ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

''علماء امت میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ اس کے سامنے صحیح حدیث رسول پیش کی جائے اور وہ اسے رد کردے، اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو یہ اس وجہ سے کہ اس کے نزدیک وہ حدیث منسوخ تھی، یا اس کی سند میں کچھ طعن تھا ورنہ تو ایسے شخص کو امام بنانا تو کجا اس کی عدالت ہی ساقط ہوجاتی ہے، اور وہ فسق سے متہم ہوجاتا ہے۔ لوگوں نے امام ابوحنیفہؒ پر مرجیہ ہونے کا الزام لگایا ہے (جو غلط ہے)، حالانکہ بعض دیگر حضرات کو بھی مرجیہ کہا گیا، مگر ان کے بارے میں تنقیدی اور مذمتی اقوال بیان کرنے پر کسی نے توجہ نہ کی ہے، امام ابوحنیفہؒ کی امامت کی وجہ سے آپ کے بارے میں لوگوں نے ایسے اقوال خوب نقل کیے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ امام صاحب سے حسد کیا جاتا تھا اور جھوٹی باتیں آپ کی طرف منسوب کر دی جاتی تھیں، حالانکہ علماء اور اصحاب فضل کی ایک جماعت نے آپ کی تعریف بھی کی ہے۔

(علماء کے تعریفی اقوال نقل کرنے کے بعد ابن عبدالبر لکھتے ہیں): ''کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی عظمت کا اندازہ اس کے زمانہ کے لوگوں کے متضاد بیانات سے ہوتا ہے، کیا حضرت علی کے بارے میں دو جماعتیں ہلاک نہیں ہوئیں، حد سے زیادہ محبت کرنے والے اور بغض وحسد کرنے والے، حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ حضرت علی کے بارے میں دو طرح کے لوگ ہلاک ہوں گے، حد سے زیادہ محبت کرنے والے، اور جھوٹی نفرت وحسد کرنے والے۔ ہر ایک دیندار، شریف اور صاحب فضل کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم''۔

☆☆☆

❑ فیمنزم

مرد وعورت کی وراثت کا مسئلہ

(برابری کے خواہاں حضرات کے لئے پیغام)

تحریر: عطیہ عدلان

ترجمہ: محمد شعیب ندوی
(اجمل خان طبیہ کالج۔اے۔ایم۔یو)

موجودہ ترقی یافتہ دور میں ایک طرف انسان مختلف میدانوں میں ترقی کی معراج پر ہے تو دوسری طرف اس کا ذہن مذہب اور باری تعالی کے عطا کردہ دستور حیات سے متعلق پراگندہ اور مسموم ہے، خاص طور سے مغربی تہذیب کے دلدادہ نام نہاد مسلمان شریعت اسلامی پر روزانہ شکوک و شبہات اور اعتراضات کی بوچھار کررہے ہیں، یہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی اور نامرادی اور بدترین گھناؤنا عمل ہے کہ جو دستور حیات اسے اللہ نے بخشا ہے اسی کے خلاف زہر افشانی کررہا ہے یہ الگ بات ہے کہ اگر اس کو دین فطرت کے سمجھنے میں غلط فہمی ہے تو اس کو ماہرین قانون سے دور کرسکتا ہے لیکن اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اسلام کی فضا کو مسموم اور شبیہ کو خراب کرنا کہاں سے زیب دیتا ہے۔ یہ نظریہ واصول صرف اسلام کے ہی متعلق ہے جب کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے مذاہب کے متعلق ذرہ برابر بھی خامی نکالنا تو درکنار اس کے متعلق غلط سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

نام نہاد مسلمان، مغربی تہذیب وثقافت کے پروردہ، روشن خیال افراد کا عجیب وغریب مزاج بن گیا ہے کہ وہ لوگ اسلامی سرمایہ پر بے جا تنقید واحتساب کرتے ہیں حالاں کہ ان تنقیدات واعتراضات کا صحیح اسلامی سرمایہ سے ذرہ برابر کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ اس پر وہ اپنا قیمتی وقت وسرمایہ ضائع کرتے ہیں اور ان کی فکر ونظر یہ ہے کہ آج جو تشویشناک صورت حال ہے اس کا واحد سبب صرف اسلام ہے۔ ان تمام ظالمانہ وجابرانہ تحریکوں وتنظیموں سے جنہوں نے خون کی ہولیاں کھیلیں اور اللہ کی زمین پر فساد برپا کیا ان سے ذرہ برابر بھی تعرض نہیں کرتے بلکہ اسلام کو ہی فساد کی جڑ بتا کر نت نئے اعتراضات، لغویات کے ایسے شکوک وشبہات پھیلاتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا مقصد سیاستداں اور قائدین پر طعن وتشنیع نہیں ہے یہ تو ان کا مشغلہ ہے اور انہوں نے ان برے مقاصد کی برآری کی خاطر سیاست وقیادت ہرگز نہیں کی ہے، البتہ ان روشن خیال اور نام نہاد متجد دین، اور بسا اوقات اپنے آپ کو عالم دین کے لقب سے متصف کرنے والوں کو ملامت کے مستحق سمجھنا چاہئے، کیوں کہ یہی لوگ اسلام کے خلاف چند ٹکوں میں زہر افشانی کرتے ہیں۔

ان کے شکوک وشبہات میں سے ایک اعتراض اسلام میں مرد وعورت کی میراث سے متعلق ہے۔ چناں چہ وہ لوگ قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن نے مرد وعورت

کی میراث کو برابر کیوں نہیں تقسیم کیا ؟ کیوں عورت کی میراث مرد کے مقابلہ میں آدھی رکھی؟ کیا ان دونوں میں برابری انصاف کا تقاضا نہیں ہے؟ خاص طور سے اس ترقی یافتہ دور میں عورت مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ہے، وہ ملازمت بھی کررہی ہے۔ اپنے اور دیگر لوگوں کے مصارف بھی برداشت کررہی ہے۔ان نعروں اور پروپیگنڈوں کی وجہ سے بعض اسلامی ممالک میں خدائی نظام اور شریعت مطہرہ میں تبدیلی کی آواز بلند کی گئی۔ چناں چہ ہم ان اعتراضات کا مندرجہ ذیل سطور میں جواب رقم کرتے ہیں۔

محکم کا علم ضروری:

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن کریم میں جو(للذکر مثل حظ الانثیین) کا حکم آیا ہے وہ اس متوفی کے بارے میں ہے جس کی اولاد اور بھائی موجود ہوں، یہ حکم محکم ہے اسی پر تمام علماءمتفق ہیں۔اس کو متشابہ سمجھ کر اجتہاد کے گھوڑے دوڑانے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔محکم کا معلوم ہونا ضروریات دین سے ہے اور اس کا انکار کرنا یا اس کے متعلق تجاہل عارفانہ برتنا اپنے ایمان و عقیدہ کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔

اطاعت وفرمابرداری:

اللہ رب العالمین کے حکم کے آگے سرتسلیم خم کردینا فرض ہے خواہ ظاہرا وہ ہماری عقل کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔اس لیے کہ خالق کائنات اپنے بندوں کی مصلحتوں وحکمتوں کے متعلق زیادہ جاننے والا ہے، اس کو بخوبی معلوم ہے کہ کونسی چیز حق وعدل کے مطابق ہے۔اطاعت وفرمابرداری ایمان کا جزو اعظم اور اسلام کا مغز ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّىَ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً۔ (النساء:۶۵)''اے محمدﷺ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔''

اسی بندگی وتعمیل حکم کے پیش نظر حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما الصلاۃ والسلام کی بندگی وتعمیل حکم کے متعلق اللہ رب العزت نے ارشادفرمایا: قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاء اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔(الصافات: ۱۰۲)''حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جارہا ہے اسے کرڈالئے، آپ ان شاءاللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔''دوسری جگہ ارشاد فرمایا: فلماأَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (الصافات:۱۰۳) ''آخرکو جب ان دونوں نے سرتسلیم خم کردیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرادیا۔''

ان دونوں حضرات نے اللہ کے حکم کی حکمت ومصلحت نہیں جانی بلکہ جیسے ہی حکم ملا فورا سرتسلیم خم کردیا اور اللہ کی اطاعت وفرمابرداری کا بے نظیر و بے مثال طریقہ قائم کر دکھایا، باپ نے کچھ تردد کیا نہ بیٹے نے۔ کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ وہ خالق کائنات کے غلام و بندے ہیں جس طرح کا بھی وہ حکم دے گا اس کو بجالانا ہے۔ اسی طرح ہماری بندگی اور اللہ کی تابعداری کا تقاضہ ہے کہ ہم اس کے حکم کو بغیر کسی مصلحت و حکمت کے ظاہر ہوئے فورا بجالائیں۔ یہی اللہ کے نیک بندوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔کیوں کہ جولوگ اللہ کے حکم کو صرف اس بنا پر تسلیم نہیں

کرتے کہ ان کو اس کی مصلحت وحکمت سمجھ میں نہیں آتی تو یہ روش وطریقہ شیطان کا ہے۔ جب شیطان سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے کہا تھا کہ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ (ص:۷۶) ''شیطان نے جواب دیا ''میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس (آدم علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا ہے''

اس طرح کے اعتراضات وسوالات کے جوابات دینے کے لیے یہ وصف سب سے اہم ہے کیوں کہ اللہ کے احکام کے پس پردہ مصلحتوں وحکمتوں کی بوچھار کرنے سے خودغرض اور معترضین کے مقابلہ میں علماء ومتشرعین کو دفاعی موقف اختیار کرنا پڑے گا اور دفاعی موقف ہر جگہ نہایت کمزور ہوتا ہے۔

عدل و مساوات کا فرق:

عدل (انصاف) اور مساوات (برابری) میں فرق کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کیوں کہ عدل ومساوات ایک دوسرے کے ہم معنی ومترادف نہیں ہے۔ عدل کی صورت میں مساوات تو ثابت ہوسکتی ہے لیکن مساوات کے ذریعہ عدل متحقق نہیں ہوسکتا ہے۔ مساوات دو ہم جنس چیزوں کے درمیان ہر اعتبار سے برابری کا متقاضی ہے جب کہ عدل میں برابری وتفاوت دونوں ممکن ہے۔ اگر چہ وہ تفاوت وزیادتی بعض اعتبار سے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی عدل ہے۔۔۔

ذیل کی مثال سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ایک کارخانہ وکمپنی میں بہت سارے مزدور و ملازمین کام کرتے ہیں وہ تمام ملازمین عزت وشرافت، انسانیت وتکریم نفس میں سب برابر ہیں، سب حسن سلوک کے مستحق ہیں، سب کے ساتھ انسانیت کی بنا پر یکساں سلوک کیا جانا چاہیے لیکن وہ تمام لوگ اپنی صلاحیت واستعداد، طاقت وقوت، اپنے ذرائع ووسائل، اپنے عہدوں ومناصب کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ہر ایک کی اپنی حیثیت قابلیت وصلاحیت کی بنا پر الگ الگ ذمہ داریاں وواجبات ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تنخواہیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ کسی کی زیادہ کسی کی کم۔ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ مرد وعورت کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح ہے۔ دونوں رحمت وشفقت، شرافت وکرامت، اور انسانیت کے مستحق ہیں، خواہ بھائی ہو یا بہن، انسانیت کی بنا پر سب کے حقوق یکساں ہیں۔ لیکن مرد وعورت اپنی اپنی صلاحیت واستعداد وذمہ داریوں کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ مرد کی صلاحیت عورت سے اور عورت کی استعداد مرد سے متفاوت ہے۔ اسی طرح دونوں کی ذمہ داریاں اور واجبات الگ الگ ہیں۔ اسی کے پیش نظر انصاف کا تقاضا ہے کہ میراث میں بھی برابری نہ ہو۔

عورت کی نصف میراث:

چوتھی بات یہ ہے کہ عورت بعض حالات میں متوفی کی نصف میراث کی مستحق ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کو وراثت میں حصہ دوسرے ناحیہ سے بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مہر و نفقہ کی صورت ہے۔ اس میں مرد دینے والا اور تاوان اٹھانے والا ہوتا ہے۔ ظاہری طور پر دیکھا جائے تو مرد کا نقصان اور عورت کا فائدہ ہو رہا ہے۔ اسی کے پیش نظر بعض مرتبہ عورت لینے والی ہوتی ہے اور بعض اوقات چھوڑنے والی ہوتی ہے۔ جو وہ چھوڑتی ہے حقیقت میں وہ دوسری عورت کے لیے چھوڑنے والی ہوتی ہے جس کے لیے چھوڑ رہی ہے وہ اس کی بھابھی ہے یعنی وہ اپنی بھابھی کے لیے چھوڑنے والی ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ عورت تو مرد کی طرح کماتی اور

خرچ بھی کرتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورت کا مردوں کی طرح کمانا اور خرچ کرنا یہ عمومی بات نہیں ہے بلکہ ایک استثنائی صورت ہے۔ آج بھی عورتوں کی اکثریت مردوں کے رحم وکرم پر ہے۔ اسی کے ساتھ استثنائی صورت کا حکم شاذ و نادر ہے جس کا کوئی حکم نہیں ہوتا ہے۔

مزید اسلام کی نظر میں یہ کوئی فطری وطبعی اصول بھی نہیں ہے کہ اس کو دوسروں پر نافذ کیا جائے۔ لہذا اسلام کے متعلق کوئی بھی ایسی صورت حال و واقعہ کو منطبق نہیں کیا جاسکتا جو اس کے قوانین وقواعد اور افکار ونظریات کا حامل نہ ہو۔ فطری طور پر مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ محنت و جفاکشی اور معاشی و اقتصادی سرگرمیوں کی انجام دہی مرد پر ہے۔ گھریلو ذمہ داری اور اولاد کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری عورت کی ہے تو کیسے فطرت سے انحراف و بغاوت کی جاسکتی ہے۔ اور کس بنیاد پر شریعت مطہرہ میں تبدیلی ممکن ہے؟

۵۔ صرف یہ کہنا کہ بعض حالات میں عورت متوفی کی میراث کی نصف کی مستحق ہوتی ہے صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ حالات بہت کم ہیں۔ چناں چہ اگر متوفی کی اولاد بھائی اور دیگر مرد وعورتیں ہیں تب تو مرد کو دو مؤنث کے برابر میراث میں حصہ ملے گا۔ اسی طرح اگر متوفی کے بھائی ہیں تب بھی یہ اصول ہے۔ شرط یہ ہے کہ بھائی محجوب نہیں ہورہے ہوں۔ لیکن یہاں بہت سارے ایسے حالات ہیں جہاں پر اس کی حکم عدولی ہورہی ہے۔ مثلا اگر اخیافی بھائی موجود ہیں تو عورت کو مردوں کے برابر حصہ ملے گا۔ اکثر حالات میں کبھی کبھی عورت مرد سے زیادہ کی مستحق ہوتی ہے۔ مثلا اگر متوفی کی بیوی، حقیقی بہن اور علاتی بھائی ہوتا تو بیوی کو ربع، بہن کو آدھا اور باقی عصبہ کی بنیاد پر علاتی بھائی کو ملے گا اور بقیہ ربع کے برابر ہوگا۔ اسی طرح اگر متوفی کی ایک بیٹی اور دس بھائی ہیں تو بیٹی کو نصف ملے گا اور بقیہ آدھا دس بھائیوں میں تقسیم ہوگا۔

وراثت کا معیار:

۶۔ وارثین کے درمیان تفاوت کچھ معیاروں کے تابع ہیں اور یہ معیار مذکر ومؤنث نہیں ہیں کیوں کہ اگر مذکر مؤنث معیار ہوتا تو مرد کو ہمیشہ آدھا (نصف) ملتا جو بالکل درست نہیں ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ بلکہ مرد کو نصف ملنا تو صرف کچھ حالات میں ہے۔ وارثین کے درمیان جو معیار ثابت ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ قرابت، رشتہ داری۔ جس جانب اور جس قدر مضبوط رشتہ داری ہوگی اسی لحاظ سے باعتبار کمی وزیادتی وراثت میں حصہ ہوگا۔

۲۔ دوسرا معیار زندگی سے متعلق وارث کی حالت و کیفیت ہے۔ وارث کی موجودہ زندگی میں کیا ذمہ داریاں ہیں یا وہ گھر کا منتظم ہے یا ولی یہ چیز دیکھی جائے گی؟ مثلا اگر کسی کا انتقال ہوا اس نے والدین اور بیٹی و بیٹا چھوڑے تو باپ کو چھٹا حصہ، ماں کو بھی چھٹا حصہ بیٹی اور بیٹے کے مابین للذکر مثل حظ الانثیین کے تحت تقسیم ہوگا۔ بیٹے کا حصہ دو ثلث ہوگا اور بیٹی کا حصہ ثلث کے باوجود باپ مرد کے حصہ سے زیادہ ہے۔ یہ اس لیے کہ بیٹی کو زندگی کا سامنا کرنا ہے یعنی بیٹی باپ کے بعد آتی ہے تو بیٹی کو اس کے مقابلہ میں عمر کے لحاظ سے ملے گا اور باپ کو اس کی زندگی کے اعتبار سے ملے گا۔

۷۔ اسلام کے خلاف زہر افشانی کرنے والے معترضین کوتاہ بینوں کو ہرگز یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلام نے ہی

عورت کو بچایا ہے اس کے مقام و مرتبہ کو واضح کیا ہے اور اس کے ساتھ ہر چیز میں انصاف و برابری کا معاملہ کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انکار و عداوت کی بنا پر اسلام کی آفاقیت وابدیت کو نظر انداز کر کے اسی کو اپنے اعتراضات وشکوک و شبہات کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ چناں چہ زمانہ جاہلیت میں عورت کی حیثیت و مقام و مرتبہ سے کون واقف نہیں ہے؟ عہد جاہلیت میں اس کے ساتھ درندگی وسفا کی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس کو تمام حقوق و مراعات سے محروم رکھا جاتا تھا۔ خود اس کی ذات کو میراث میں دیگر سامان کی طرح تقسیم کیا جاتا۔ اسلام نے اس پر سختی کے ساتھ قدغن لگائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے؟ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُواْ النِّسَاء كَرْهاً۔ (النساء:۱۹) ''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔''

اس کے انسانی حقوق سلب کر لیے گئے تھے، اس کی عزت وشرافت کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ اسلام نے اس کے انسانی حقوق ہی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ مردوں کی صف میں کھڑا کیا۔ وراثت اور رتمام حقوق کا حقدار قرار دیا۔ اسلام کے نزدیک اس کی حق تلفی کبھی بھی برداشت نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ مژدہ صرف اسلام کا دیا ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاء نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيباً مَّفْرُوضا۔ (النساء:۷) ''مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

جاہلیت میں جو عورت کا مقام و مرتبہ تھا جو اس کے متعلق تصورات ونظریات تھے، وہی تمام چیزیں انگریزی قانون میں ۱۸۰۵ء تک قائم رہیں ان کے یہاں تو شوہر کے لیے بیوی کو بیچنا، اس کی محدود رقم متعین کرنا تک جائز تھا۔ آج یہی اپنی روشن خیالی کا ثبوت دے کر عورت پر اپنے گذشتہ مظالم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے، اس کی تعلیمات و احکامات فطرت کے عین مطابق ہیں، خالق کائنات کے عطا کردہ دستور حیات میں کسی قسم کی ترمیم وتبدیلی کی گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالی نے اس میں اتنی لچک رکھی ہے کہ وہ ہر زمانہ و ہر علاقہ کی ضروریات اور تقاضوں کے ہم راہ رہ سکتا ہے، اس کے تمام احکام وقوانین مصلحتوں وحکمتوں پر مبنی ہیں البتہ ان حکمتوں میں سے تمام کی افہام وتفہیم سے ہماری عقلیں قاصر ہیں، ارشاد باری ہے: فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (الروم: ۳۰) '' اے لوگوں قائم ہوجاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالی نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت وقانون بدلا نہیں جاسکتا، یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

☆☆☆

❑ افکار و نظریات

اسلامی نظریۂ تعلیم
امام بدیع الزماں سعید نورسی کے رسائل کی روشنی میں

عربی تحریر: ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی
اردو ترجمانی: شفاء اللہ ندوی

بچوں کی صحیح طریقہ پر تعلیم وتربیت ایک اہم دینی فریضہ ہے ،جس کی فرضیت قرآن سے ثابت ہے ،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :''اے ایمان والو!تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی)اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (اور سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں ۔جس پر تند خو(اور) مضبوط فرشتے (متعین) ہیں، جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں۔ جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو (فوراً) بجالاتے ہیں۔(سورہ تحریم، آیت نمبر ٦)

چنانچہ آیت کریمہ اولاد کی تعلیم اور ان کی تربیت کی اہمیت کو بیان کرتی ہے ،اور اہل ایمان کو اپنے اہل وعیال کی تعلیم وتربیت کرنے اور انھیں اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر ابھارنے اور اللہ کی نافرمانی وسرکشی سے باز رکھنے اور انھیں اچھی باتوں کی تلقین کرنے اور حسن ادب سے آراستہ کرنے کا حکم دیتی ہے ،تاکہ وہ بھی ان کے ساتھ اس بھیانک اور پرخوف (جہنم کی) آگ کی زد میں نہ آسکیں جو اسی طرح انسانوں اور پتھروں سے سلگائی جائے گی جس طرح دوسری آگ لکڑی سے سلگائی جاتی ہے۔

اولاد کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری براہ راست والدین اور اساتذہ کی پشت پر ہے ،اگرچہ معاشرہ ،ملت اور حکومت بھی اس امر میں شریک ہیں۔اس لیے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس معاملہ پر پوری طرح متوجہ ہوں، کیونکہ اس سلسلہ میں ان کی ادنیٰ کوتاہی بہت بڑے خطرات کو جنم دے سکتی ہے اور خاص طور سے موجودہ حالات میں جب کہ ان میں بہت سی سماجی بیماریاں اور متعدد اخلاقی امراض پیدا ہو چکے ہیں۔

اسلامی نظریۂ تعلیم:

اسلام ہر فرد بشر کے لیے تعلیم وتربیت کو ضروری قرار دیتا ہے ،کسی فرد کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس سے بے نیاز رہ سکے، گویا تعلیم تمام انسانوں کا ایک مشترک اور عام حق ہے، کسی جماعت اور کسی طبقہ سے خاص یا اس کی جاگیر نہیں ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کی خصوصیات:

اسلامی نظام تعلیم مندرجہ ذیل خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہے:

۱۔ **اللہ کے نام سے مربوط علم**:۔

علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے نام سے مربوط ہو، یہاں تک کہ وہ معاشرہ اور انسانیت کے لیے مفید ہو، جب کہ تہدیم وتخریب اور کسی نقصان اور ضرر کا ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو، چنانچہ خداوند قدوس کا ارشاد ہے:''(اے پیغمبر ﷺ) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجیے''(سورہ علق ،آیت نمبر ا)

۲۔ **نفع بخش علوم کا انتخاب** :۔

اسلامی نقطۂ نظر سے مناسب ہے کہ نفع بخش علوم کا انتخاب

اورضرر رساں علم سے اجتناب کیا جائے، چنانچہ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے بعد فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ میں نفع بخش علم، پسندیدہ اور مقبول عمل اور پاک رزق کا سوال کرتا ہوں'' (ابن ماجہ حدیث نمبر ۹۲۵)

۳۔ تعلیم کی فرضیت کی تعمیم :۔

سورہ انفال آیت نمبر ۲۷ کے تحت خدا تعالیٰ کے اس ارشاد ''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں خلل مت ڈالو اور تم تو (اس کا مضر ہونا) جانتے ہو'' کی روشنی میں ہر مسلم مرد اور عورت دونوں پر دین کی بنیادی تعلیم حاصل کرنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حقوق کی ادائیگی بغیر بنیادی تعلیم کے ناممکن ہے۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۲۴)

۴۔ پڑھنے اور پڑھانے پر اجرو ثواب کی ترتیب :۔

اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم و تعلم یعنی پڑھنے اور پڑھانے دونوں پر اجروثواب ملتا ہے۔ اس لیے طالب علم اور استاد دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر عمل پیہم اور جہد مسلسل کریں۔ چنانچہ حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ علم کی تحصیل کے لیے کوئی شخص اگر مسافت طے کرے یا راہ چلے، اس کے عوض اللہ تعالیٰ جنت کی راہوں میں سے ایک راہ پر اسے چلائے گا، اور بلاشبہ ملائکہ طالب علم کی خوشنودی کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں، اور بیشک عالم کے لیے آسمان وزمین کی تمام مخلوقات وکائنات اور پانی میں پائی جانے والی مچھلیاں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔ اور عالم کو عابد پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی چودھویں کے چاند کو تمام ستاروں پر ہے۔ یقیناً انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں، تو جس شخص نے اس کو حاصل کیا گویا اس نے بڑی سعادت حاصل کی۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر ۳۶۴۱)

حضرت ابومسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو کسی اچھے کام کی رہبری کرے گا اس کو اس کے کرنے والے کے برابر اجر و ثواب ملے گا۔ (مسلم حدیث نمبر ۱۸۹۳)۔

۵۔ بلا معاوضہ تعلیم :۔

اسلام بلا معاوضہ تعلیم و تربیت کا قائل ہے، لہٰذا حکومت و اقتدار اور اصحاب خیر پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان طلبا کی، جن کے پاس روپیہ اور پیسہ نہیں ہے، کفالت کریں اور ان کی جملہ ضروریات کا خیال رکھیں۔ کیونکہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اور آپس میں نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں پر مدد کرو اور گناہ وظلم وزیادتی پر ہرگز تعاون نہ کرو'' (سورہ مائدہ آیت نمبر ۲)

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبیؒ اپنی شاہکار تصنیف ''جامع احکام القرآن'' جلد نمبر ۶ رصفحہ ۴۷ پر رقم طراز ہیں: بھلائی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کی مختلف شکلیں ہیں۔ مثلاً: عالم کا لوگوں کو اپنے علم کے ذریعہ انہیں علم سکھا کر فائدہ پہونچانا اور مالداروں کا اپنے مالوں کے ذریعہ ان کی مدد کرنا، بہادر شخص کا اللہ کی راہ میں بہادری کا مظاہرہ کرنا اور تمام مسلمانوں کا ایک ہاتھ کی طرح سامنے آنا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں ہر مومن شخص سے اس کی جان سے زیادہ قریب ہوں، جو کوئی مال چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے اہل خانہ کا ہوگا، اور جو قرض چھوڑ کر گیا یا کوئی ضائع ہونے والی اولاد چھوڑ کر اس جہان فانی سے کوچ کیا ہو تو اس (قرض) کی ادائیگی اور اس (اولاد) کی بھرپائی اور کفالت میرے ذمہ ہے۔ (مسلم ۸۶۷)

۶۔ تعلیم کی ترویج و اشاعت:۔

قوم وملت اور ریاست وحکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ

تعلیم کی نشر واشاعت اوراس کی ترویج وتعمیم اس پیمانے پر کرے کہ کوئی شخص ناخواندہ نہ رہ جائے،اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'' آپ کہیے کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں! اور وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو لوگ اہل عقل (سلیم) ہیں'' (سورہ زمر،آیت نمبر۹)

حضرت ابوبکرؓ کا فرمان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا :''علم سیکھو اور اسے لوگوں کو سکھاؤ''۔(بیہقی،حدیث نمبر۱۷۴۲)

۷۔ پاک وصاف اور صالح ماحول میں تعلیم :۔

تعلیم وتربیت کے باب میں مناسب ہے کہ ایسے صالح اور صاف ستھرے ماحول میں اس کا بندوبست کیا جائے کہ ماحول کی ہر شے تعلیم کے حصول میں معاون ثابت ہو،اسی طرح طالب علم کو مدرسہ یعنی تعلیمی ادارہ، گھر، ملک، حکومت، اساتذہ کی جانب سے انسیت ولگاؤ، خیر خواہی اور ہمدردی حاصل ہو۔ چنانچہ ابو ہارون عبدی بصری عمارہ بن جوین کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ ابوسعید خدری کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو وہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت مبارک ہو، بیشک رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ بیشک لوگ آپ کے پیروکار ہیں اور یقیناً لوگ زمین کے کناروں سے تمہارے پاس دین کا علم حاصل کرنے کی غرض سے آئیں گے، چنانچہ جب وہ آئیں تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔(ابن ماجہ۲۴۹)۔

۸۔ علم پر عمل آوری اور اس کی اشاعت:

مناسب ہے کہ طلبا میں علم پر عمل کے جذبات ابھارنے اور اس کی اشاعت وترویج کی کامیاب کوشش کی جائے۔اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے:''اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضگی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں'' (سورہ صف،آیت نمبر۱-۲)

حضرت حسن فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم کی دو قسمیں ہیں: ۱۔وہ علم جو دل میں ہوتا ہے اور یہی علم نافع ہے ۲۔ وہ علم جو زبان پر ہوتا ہے اور یہ علم بندوں پر اللہ کی طرف سے حجت ہے۔(ابن شیبہ حدیث نمبر۳۵۵۰۲)

اللہ پاک کا ارشاد ہے:''سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی (اس) قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس واپس آئیں، ڈرادیں''۔(سورہ توبہ،آیت نمبر۱۲۲)

عبدالرحمان بن ابزیؓ سے مروی ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:''لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو دین نہیں سمجھاتے، انکو تعلیم نہیں دیتے، ان کو نصیحت نہیں کرتے، ان کو بھلائی کا حکم نہیں کرتے اور انھیں برائی سے نہیں روکتے؟ اور ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے جو اپنے پڑوسیوں سے نہیں سیکھتے، دین کی سمجھ ان سے نہیں لیتے اور ان سے وعظ ونصیحت حاصل نہیں کرتے؟ خدا کی قسم لوگ اپنے پڑوسیوں کو علم سکھائیں، ان کو دینی باتیں بتائیں، انہیں وعظ ونصیحت کریں، انہیں بھلائی کا حکم اور برائی سے رہنے کی تلقین کریں اور لوگ اپنے پڑوسیوں سے علم سیکھیں، دینی تفقہ ان سے حاصل کریں اور ان سے نصیحت پکڑیں ورنہ میں ان کو سزا دینے میں جلدی کروں گا'' (طبرانی حدیث نمبر۷۴۸)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''میرے حوالے سے لوگوں کو (علم دین) پہونچاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو'' (بخاری حدیث نمبر ۳۴۶۱ اور ترمذی حدیث نمبر۲۶۶۹)۔

۹۔ طلبا کی ہمہ جہت صلاحیت کا فروغ:

ضروری ہے کہ طلبا کی صلاحیت کا ہمہ جہت اور ہر پہلو سے فروغ ہو، ان کی خوابیدہ اور پوشیدہ صلاحیتوں اور مہارتوں کو

اجاگر کرنے کے لیے سعی وکوشش کی جائے، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، ان کو ہراساں نہ کیا جائے۔ نیز ان کی حالتوں، عمروں، مزاجوں اور ان کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے نرم وملائمت، شفقت و ہمدردی کے ساتھ بہتر اسلوب اور خوبصورت انداز میں، ان کی تعلیم وتربیت کی جائے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''بیشک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں'' (سورہ قلم، آیت نمبر۴)۔ چنانچہ معلم کے شایان شان یہ ہے کہ وہ اخلاق کے اسی اعلیٰ پیمانے کو اپنائیں، جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس متصف تھی، یعنی ادب وسلیقہ، حیاء وشرم، حلم وبردباری، عفو ودرگزر وغیرہ جیسے محاسن اخلاق اپنائیں۔ اللہ کے نبی ﷺ ان امور کی رعایت فرمایا کرتے تھے، چنانچہ ابو وائل سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ عبداللہؓ لوگوں کو ہر جمعرات کو تذکیر کیا کرتے تھے، تو ان سے کسی شخص نے کہا کہ اے ابوعبدالرحمان میری خواہش ہے کہ آپ ہردن ہمیں تذکیر وتبلیغ کریں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ بلاشبہ مجھے اس سے باز رہنے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے تم کو اکتا دینا پسند نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تم کو وعظ ونصیحت کے باب میں خیال رکھتا ہوں جیسا کہ حضور صلی اللہ ﷺ ہماری اکتاہٹ کے پیش نظر ہمارا خیال رکھتے تھے۔ (بخاری حدیث نمبر۷۰/ مسلم حدیث نمبر۲۸۲۱)

معلم کی مناسب اور لائق دید خصوصیات یہ ہیں کہ وہ شفقت و ہمدردی اور نرمی ورفق، اچھی اور صالح حکمت ودانائی، پرکشش اسلوب ودلکش انداز، خوش مزاجی اور سہل پسندی جیسی صفات کا حامل ہو۔ چنانچہ معاویہ بن حکم سلمیؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے لوگوں میں سے کسی شخص کو چھینک آ گئی، تو میں نے کہا: یرحمک اللہ، لوگ مجھے گھور کر دیکھنے لگے، تو میں نے کہا: آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کہ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ تو لوگ اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے، جب میں نے ان کو دیکھا تو وہ مجھے خاموش کر رہے تھے، اس لیے میں چپ رہا، جب اللہ کے رسول ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو میرے ماں باپ ان پر قربان، میں نے ان سے پہلے اور ان کے بعد آپ ﷺ جیسا معلم ومربی نہیں دیکھا، جو آپ ﷺ سے بہتر طریقے پر تعلیم دیتا ہو۔ چنانچہ خدا کی قسم نہ وہ مجھ پر غصہ ہوئے، نہ مارا اور نہ ہی برا بھلا کہا، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ یہ نماز ہے اس میں لوگوں کی بات کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ نماز دراصل تسبیح، تکبیر اور قرأت قرآن ہے۔ (دارمی، ۱۵۰۲) حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: آسانی کا معاملہ کرو سختی سے رکو، خوش کرو متنفر مت کرو۔ (مسلم حدیث ۱۷۳۴)۔

۱۰۔ تعلیم وتعلم کا مقصد اللہ کی خوشنودی کی تحصیل اور اس کی مخلوقات کی نفع رسانی:۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے کہ تعلیم وتعلم کا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا اور اس کی مخلوقات کو نفع پہونچانا ہو، نہ یہ کہ صرف ڈگریوں اور اسناد کا حصول، مال ودولت کی تحصیل، اونچے عہدے اور بلند مناصب پر فائز المرامی اور عملی مہارتوں اور لیاقتوں پر فخر وناز کرنا ہو۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وہ لوگ دنیاوی اسباب کا حصول چاہتے ہیں اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے'' (سورہ انفال آیت ۶۷)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی نے کوئی علم غیر اللہ کے لیے سیکھا یا اس علم کے ذریعہ غیر اللہ کی رضا وخوشنودی کو پیش نظر رکھا تو ایسا شخص جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنائے'' (ترمذی حدیث ۲۶۵۵)۔ راوی حدیث حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ نبی پاک علیہ السلام نے فرمایا:

جس شخص نے کوئی علم حاصل کیا جس کے ذریعہ اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے ،اس غرض سے حاصل کیا کہ دنیا وی سازو سامان حاصل ہوجائے یا کوئی عہدہ یا منصب ہاتھ آجائے ،تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا۔(مسند احمد حدیث نمبر ۸۴۵۷)

۱۱۔ غیر مسلموں کو حاصل شدہ تعلیمی آزادی :

غیر مسلموں پر بغیر ان کی رضامندی کے کوئی تعلیم جبراً لازم نہیں کی جائے گی، بلکہ ان کو اپنی مخصوص درسگاہوں اور مدرسوں کے قیام کے لیے مکمل مواقع عطا کیے جائیں گے تاکہ وہ اپنے عقائد اور دینی آراء ونظریات کے مطابق اپنی مذہبی تعلیمات حاصل کرسکیں۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''دین میں زبردستی نہیں کی جاسکتی''(سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۵۶)

اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کی غرض وغایت :

اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم وتربیت کا مقصد اور مطمح نظر نوع انسانی کے تمام افراد کو قابل اور صالح بنانا ہے تاکہ وہ انسانی معاشرہ کے لیے فائدہ بخش اور نفع رساں بن سکیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام علوم خواہ دینی ہوں یا عصری اللہ کے نام سے مربوط ہوں اور دنیا کے خالق کے تعارف سے جڑے ہوئے ہوں۔علامہ بدیع الزماں سعید نورسیؒ نے کیا خوب تحریر کیا ہے کہ''بیشک وہ تمام علوم جو تم سیکھتے ہو ہمیشہ اللہ کا پتہ دیتے اور اپنی خاص زبان میں نہایت کرم فرما خالق کائنات ومالک کل کا تعارف کراتے ہیں''۔مثلا:

(۱)ایک بہت بڑی فارمیسی ہے،اس میں موجود ہر شیشی میں دوائیں ہیں،ان دواؤں میں مقوی تیارشدہ اشیاء یا اجزاء ومفردات نپے تلے متوازن اور درست ومقررہ انداز میں رکھے گئے ہیں، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان دواؤں کے پیچھے کوئی دانا دواساز اور ماہر کیمیا داں ہے جو ان کاموں کو انجام دیتا ہے۔ٹھیک اسی طرح کرۂ ارضی کی فارمیسی ہے جس میں چار لاکھ اقسام کے نباتات وحیوانات پائے جاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک درست کیمیائی مفردات کی شیشی اور عجیب وغریب مقوی ادویات کی بوتل کے برابر ہے۔چنانچہ یہ بڑی فارمیسی یا وسیع وعریض دوا خانہ اس کے حکیم وذوالجلال فارماسسٹ خداوند قدوس کا پتہ نہ صرف یہ کہ بینا لوگوں کو دیتا ہے بلکہ نابینا تک کو دے دیتا ہے۔نیز اس کے خالق کا تعارف، اس کے درجہ کمال، حسن انتظام اور اس کی عظمت ومنزلت کی وضاحت کے ساتھ وہ علم طب جسے آپ پڑھتے ہیں کے مقرر کردہ معیار کے مطابق بازار میں پائی جانے والی فارمیسی پر قیاس کرتے ہوئے، کراتا ہے۔

(۲)جس طرح ایک حیرت انگیز اور عجیب وغریب فیکٹری جو ایک بہت سادہ مادے سے ہزاروں قسم کے رنگ برنگ کپڑے تیار کرتی ہے،ہمیں بتاتی ہے کہ ان پیداوار کے پیچھے بلاشک وشبہ میکینکل ماہر انجینئر ہے اور فیکٹری اس کا تعارف بھی کراتی ہے،ٹھیک اسی طرح یہ ربانی چلتی پھرتی مشین جو کرۂ ارضی کے نام سے موسوم ہے،اللہ کا تعارف کراتی ہے۔یہ الٰہی فیکٹری جس میں سینکڑوں ہزار بڑی بڑی فیکٹریاں ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں سینکڑوں ہزار مخصوص اور ماہر فیکٹریاں ہیں بلاشبہ ہم سے اس کے خالق ومالک کا تعارف کراتی ہیں۔مشینی سائنس جسے آپ پڑھتے ہیں کے معیار کے مطابق اس الٰہی پلانٹ کے درجہ کمال اور اس کی عظمت کو اس انسانی فیکٹری یا پلانٹ پر قیاس کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔(الشعاعات،نورسی ص۲۴۳-۲۴۴)۔

☆☆☆

❑ اصلاح معاشرہ

نکاح میں لڑکی کی رضامندی اور ہمارا سماج

ابوالکلام آزاد ندوی

شادی بیاہ انسانی زندگی کا ایک اہم معاملہ ہے،قرآن کریم نے جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں عقائد ،عبادات ،اور معاملات پر بحث کی ہے، اس سے کہیں زیادہ ازدواجی زندگی کے معاملات، گواہی،مہر،ولی،لڑکی کی رضامندی، کفالت، ایلاء،ظہار،طلاق،خلع ،عدت ،لعان،وراثت اور خاندانی نظام پر بحث کی ہے۔

ان معاملات میں عاقل بالغ عورت کو عاقل بالغ مرد کی طرح تمام اختیارات حاصل ہیں،شادی کے سلسلہ میں جہاں تک لڑکی کی رضامندی اور پسند کا معاملہ ہے قرآن مجیداوراحادیث کے پیش نظر چند نکات سامنے آتے ہیں۔

دینی حدود کے اندر رہ کراپنی ذات کے متعلق اپنی مرضی اور پسند کا پورا پورا اختیار حاصل ہے ،اللہ تعالی نے فرمایا: ''**واذاطلقتم النساء فبلغن اجلھن فلاتعضلوھن ان ینکحن ازواجھن**" (آیت۲۳۲سورۃ البقرۃ)اس آیت میں کہا گیاہے کہ جب تم اپنی بیویوں کوطلاق دے دواوروہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں یعنی ان کی عدت مکمل ہوجائے تو ان کو دوسرے شوہروں سے نکاح کرنے سے مت روکو،اس آیت میں نکاح کرنے کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے،معلوم ہوا کہ عورت اپنے نکاح کی خودحقدار ہے۔

حدیث شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی بیوہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لی جائے ،اور نہ کسی کنواری کا نکاح کیا جائے یہاں تک کہ اس سے اجازت لی جائے لوگ عرض گزار ہوئے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس کا اذن کیسے؟ فرمایا کہ وہ خاموش ہوجائے (متفق علیہ)

کسی کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف کسی مرد سے اس کا جبراً نکاح کردے ،حدیث شریف ہے کہ میں حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ عورت اپنے نفس کا ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے،اور کنواری سے اس کا باپ اس کی ذاتی رائے لے گا،اور خاموش ہوجانا اس کا اجازت دینا ہے۔(مسلم شریف)

ازدواجی زندگی کے بعد اگر شوہر و بیوی کی خوشگوارزندگی میں ناخوشگواری پیدا ہوگئی ہواور باہم مل جل کر رہنا ناممکن ہوگیا ہوتو ان حالات میں شریعت جس طرح مرد کوطلاق کے ذریعہ ازدواجی تعلق ختم کرنے کی اجازت دیتی ہے اسی طرح عورت کو بھی خلع اور فسخ کے ذریعہ علیحدگی کی اجازت دیتی ہے، بخاری شریف میں ہے کہ حضرت خنساء بنت خزامؓ کا بیان ہے کہ جب وہ بیوہ تھیں تو ان کے والد ماجد نے ان کا نکاح کردیا،اور وہ اسے ناپسند کرتی تھیں، پس وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوگئیں،اور آپ نے اس نکاح کو ردفرمادیا(بخاری)

اسی بنا پر اسلامی قانون کا فتویٰ ہے کہ کسی باپ یا بادشاہ کے لئے جائز نہیں کہ اپنی لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے

بغیر کرے، اگر وہ ایسا کریں تو نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر وہ اس کو منظور کرے تو نافذ ہو جاتا ہے، ورنہ ٹوٹ جاتا ہے، **ولا یجوز للولی اجبار البکر البالغة العاقلة علی النکاح** (اور جائز نہیں ہے ولی کے لئے بالغہ عاقلہ کو نکاح کے لئے مجبور کرنا (قدوری) **وینعقد نکاح المراة الحرة البالغة العاقلة برضائها وان لم یعقد علیها ولی بکرا کانت او ثیبا** (منعقد ہو جاتا ہے، آزاد، بالغہ اور عاقلہ عورت کا نکاح اس کی رضامندی سے اگر چہ اس کے ولی نے نہ کیا ہو۔ لڑکی کنواری ہو یا ثیبہ ہو۔ (قدوری)

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات اور فقہائے کرام کے اقوال سامنے آجانے کے بعد بھی ہم اس وقت دور جہالت میں ہیں، دور جہالت میں عورت کو جس طرح زندگی کے ہر میدان میں مردوں سے کم سمجھا جاتا تھا، اسی طرح شادی کے معاملہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اس معاملے میں لڑکی کے اظہار کو بے شرمی اور نافرمانی سے تعبیر کیا جاتا تھا، والدین کے خیال میں لڑکی کو شادی کے معاملے میں بولنے کا حق دے دینا خود اس کے مفاد کے خلاف تھا، بالکل اسی طرح آج ہمارے معاشرے کا دستور یہ ہے کہ شادی کے لئے لڑکے اور لڑکی کے سرپرستوں میں باقاعدہ بات چیت طے ہو جاتی ہے، رسم و رواج کے مطابق لین دین کا سلسلہ جاری رہتا ہے، امور ضروریہ انجام پاتے رہتے ہیں، حتی کی شادی کا دن بھی مقرر ہو جاتا ہے، اور شادی کی تمام تیاریاں پائے تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں، پھر شادی کے دن عین نکاح کے وقت جبکہ دولہا کے عزیز (بارات) آچکے ہوتے ہیں، مہمانوں کا ہجوم ہوتا ہے، لڑکی عزیزوں کے مابین ہوتی ہے، اس وقت دو گواہ لڑکی کو کچھ اہم اطلاعات دے کر اس سے نکاح نامہ پر دستخط کرا کے اپنا فرض نبھا لیتے ہیں، حقیقتاً وہ دستخط لڑکی کی رضامندی کم والدین کی ایثار و قربانی کا بدل زیادہ ہوتی ہے، وہ دستخط والدین کو معاشرتی ذلت و رسوائی سے بچانے کی ایک عظیم قربانی ہے، غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ کیا اسلام اسی طریقہ کار کا متقاضی ہے؟ کیا شرعی نقطہ نظر سے رضامندی کے لئے شادی کا دن ہی موزوں ہے؟ احادیث کے الفاظ لڑکی کی اجازت طلب کرنے کے حق میں ہیں یا محض اطلاع دینے کے؟

اسلامی تعلیمات اور دربار رسالت کے فیصلوں کے مطابق اذن و اجازت کا مطلب لڑکی کو پسند و ناپسند کا اختیار دینا ہے، اور اس اختیار کو لڑکی کو اس وقت ملنا چاہئے جب وہ اپنے اس حق کا صحیح فیصلہ کر سکے۔

لہذا میرا خیال یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے ہمارے معاشرے کا مروجہ طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ حقیقت ہے کہ فطرتاً لڑکی کے مزاج میں شرم و حیا ہوتی ہے، اور لڑکی ان معاملات میں صراحت کے ساتھ اپنی رائے نہیں دے پاتی، لیکن اس شرم و حیا یا اطاعت و فرماں برداری کے پیش نظر اس کے حق کو سلب کر لینا مذہب اسلام کے منافی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر لڑکی خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ اس کی اپنی ایک سوچ، پسند اور خواہش ہوتی ہے، اسلئے سرپرست حضرات کو بات چیت طے کرتے وقت لڑکی کی اجازت لے لینی چاہئے، اس میں شک نہیں کہ لڑکی کے سرپرست اس کے خیر خواہ ہوتے ہیں، ان سے کسی بھی غلط فیصلے کی امید نہیں کرنی چاہیے، لیکن اس حقیقت کے ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات والدین لڑکی کے مزاج کو نا سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ زیادتی کر بیٹھتے ہیں، نکاح میں دونوں فریق جب تک پوری طرح مطمئن اور خوش نہیں ہوں گے اس وقت تک خوشگوار نتائج سامنے نہیں آئیں گے۔

☆☆☆

❑ مطالعات

علمی سرقے پر ابن الکتب جلال الدین سیوطی کا دلچسپ رسالہ!

نایاب حسن
مدیر اعلیٰ qindeel.in

گزشتہ دنوں میں ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، جس کا نام ہے ''مسلمانوں کا عروج و زوال کتابوں کے آئینے میں'' یہ دراصل مصری فاضل اور ایک امریکی یونیورسٹی میں قانون کے استاذ خالد ایم ابوالفضل کی انگریزی کتاب ''دی کانفرنس آف بکس'' کا اردو ترجمہ ہے، جو محمد یحییٰ خان نے کیا ہے، مشعل بکس، پاکستان سے شائع ہوئی ہے، دلچسپ کتاب ہے اور عہدِ رفتہ میں مسلم علما، فضلا، حکما و دانشوران کے کتابوں سے بے پناہ شغف پر نہایت دلچسپ پیرایے میں گفتگو کرتی ہے، اس کے پہلے مضمون میں نویں، دسویں صدی کے جید اہلِ علم و فضل علامہ عبدالرحمٰن جلال الدین سیوطی (911-849ھ) کا تذکرہ ہے، جن کا ایک لقب ''ابن الکتب'' تھا؛ کیوں کہ ان کی پیدایش کتابوں کے ڈھیر میں ہوئی تھی، ان کے والد کمال الدین ابوبکر بن محمد خود ایک اجل عالم تھے، ایک رات وہ مطالعے کے لیے بیٹھے اور اپنی بیوی کو کتابوں کے کمرے سے کوئی کتاب لانے کو کہا، وہ کتاب لینے گئیں، تو وہیں انھیں دردِ زہ اٹھا اور اسی کمرے میں لڑکے کی پیدایش ہوگئی، وہی لڑکا آگے چل کر جلال الدین السیوطی کے نام سے سارے عالم میں مشہور ہوا اور دنیا کی علمی تاریخ پر چھا گیا۔ ان سے ہم واقف تو پہلے سے تھے، مگر ایک نصابی کتاب ''جلالین'' کے واسطے سے، جو قرآن پاک کا عربی ترجمہ یا مختصر تفسیر ہے، اخیر کے پندرہ پاروں کی تفسیر سیوطی کے استاذ علامہ جلال الدین محلی (864-791ھ) کی ہے اور شروع کے پندرہ پاروں کی تفسیر علامہ جلال الدین سیوطی کی ہے، مگر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ہمیں ان کے ''ابن الکتب'' والے لقب کے بارے میں بتایا نہیں گیا تھا یا ممکن ہے بتایا گیا ہو اور وہ میرے ذہن میں نہ رہا ہو، بہر کیف یہ جان کر ایک خوش گوار حیرت ہوئی کہ ان کا لقب ''ابن الکتب'' بھی تھا، پھر ان کے بارے میں مزید پڑھنے کی خواہش ہوئی اور پڑھا، تو معلوم ہوا کہ انھیں اپنے زمانے میں کئی علوم و فنون میں درک حاصل تھا، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، معانی و بدیع سرِ فہرست ہیں؛ بلکہ ان کا دعویٰ تھا کہ ان علوم میں وہ مقامِ اجتہاد پر فائز ہیں، ملا علی قاری نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے میں پائے جانے والے ہر علم و فن پر کوئی نہ کوئی متن یا شرح لکھی ہے۔ (مرقات المفاتیح، ج: 1، ص: 347) اسی علمی ہمہ جہتی کا نتیجہ تھا کہ انھیں اپنے بارے میں یہ خیال بڑے زور سے پیدا ہوا کہ وہ دسویں صدی کے مجدد ہیں؛ بلکہ انھوں نے ایک سے زائد مرتبہ اس کا اظہار بھی کیا اور جو ان کے شاگرد یا ان کے علمی و عملی مقام و مرتبے سے واقف لوگ تھے، انھوں نے اسے تسلیم بھی کیا اور انھیں دسویں صدی کا مجدد قرار دیا، ان میں سے ایک ملا علی قاری بھی ہیں، وہ مرقات میں علامہ سیوطی کے فضل و کمال کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں: ''**یستحق أن یکون هو المجدد في القرن العاشر کما ادعاه وهو في دعواه مقبول ومشکور**''. (ایضا) وہ انھیں ''شیخ المشائخ، خاتمۃ المحدثین و

آخر المجتہدین'' قرار دیتے ہیں،مولانا عبدالحی لکھنوی نے بھی مشکوۃ پر اپنے حاشیے میں لکھا ہے کہ ''وہ اس لائق ہیں کہ انھیں دسویں صدی کا مجدد مانا جائے، جیسا کہ انھوں نے خود بھی دعوی کیا ہے''۔ (فہرس الفہارس والأثبات، ص: 1019، ط:دارالغرب الاسلامی، بیروت 1982ء)

بہر کیف اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی نہایت دلچسپ ہے، چھ سال کی عمر میں یتیم ہوگئے، آٹھ سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا، پندرہ سولہ سال کی عمر میں عالم فاضل ہوگئے اور ایک کتاب لکھ دی ''شرح الاستعاذۃ والبسملۃ''، ان کا قلم سیال تھا اور قوتِ تحریر بے مثال، علم ومعلومات کی فراوانی اور مطالعہ ومشاہدہ کا وفور؛ لہذا مسلسل لکھنے کا عمل جاری رہتا، ان کے شاگرد شمس الدین داؤدی (وفات:945ھ) کا بیان ہے کہ انھوں نے خود دیکھا کہ سیوطی نے ایک دن میں تین دفاتر (کاپیاں) لکھیں (الکواکب السائرۃ، ج:1، ص:228، ط:دارالکتب العلمیہ، بیروت 1997ء) ''حسن المحاضرۃ'' علامہ سیوطی کی ایک کتاب ہے، جس میں انھوں نے مصر وقاہرہ کی تاریخ اور وہاں کی شخصیات کا تذکرہ لکھا ہے، اس میں اپنے حالات بیان کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تصانیف وتالیفات کی تعداد تین سو بتائی ہے، داؤدی کا بیان ہے کہ ان کے شیخ کی تالیفات کی تعداد پانچ سو سے زائد ہے، تاریخ ابن ایاس میں چھ سو لکھا ہے (بدائع الزہور فی وقائع الدہور، ج:4، ص:83، ط: مکتبہ دارالباز، مکہ مکرمہ) جبکہ احمد شرقاوی اقبال نے اپنی کتاب ''مکتبۃ الجلال السیوطی'' میں ان کی تصانیف کی تعداد سات سو پچیس تک پہنچائی ہے۔ اس سلسلے میں علما نے لکھا ہے کہ چوں کہ علامہ سیوطی کی ایک ہی کتاب کے کئی ورژن ہوتے تھے، مثلاً ایک موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھی، پھر اس کو قدرے ملخص کیا، پھر مزید اختصار کیا اور سب کو الگ الگ ناموں سے شائع کرتے گئے، تو بعض لوگوں نے ایسی دو تین کتابوں کو ایک ہی شمار کرلیا اور بعض دوسرے لوگوں نے الگ الگ شمار کیا، اسی وجہ سے تعداد کی تعیین میں اختلاف ہوگیا ہے، بہر کیف یہ تو طے شدہ امر ہے کہ علامہ سیوطی اپنے دور میں کثیر التصانیف شخصیت تھے۔

ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چالیس سال کی عمر میں ہر قسم کے جھمیلے سے فارغ ہوکر مصر کے روضۃ المقیاس نامی علاقے میں مقیم ہوگئے اور پوری یکسوئی کے ساتھ قلم وقرطاس کی ہم نشینی اختیار کرلی، بڑے بڑے لوگ انھیں ہدایا تحائف بھیجتے اور وہ انھیں لوٹا دیتے، ان کی زندگی میں یکے بعد دیگرے 13/مملوک حکمرانوں کا دور آیا اور گیا، شاہانِ وقت نے انھیں کئی بار بلایا، تو انھیں جھٹک دیا؛ بلکہ اس پر بھی ایک کتاب لکھ دی ''**مارواہ الأساطین في عدم التردد إلی السلاطین**''، ایک بار سلطان غوری نے انھیں ہدیتاً ایک ہزار دینار اور ایک غلام بھجوائے، تو انھوں نے دینار لوٹا دیے اور غلام کو لے کر آزاد کردیا، ساتھ ہی بادشاہ کے آدمی کو تنبیہ کی کہ آئندہ اِدھر نظر مت آجانا، ہمیں ایسے تحفوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے!

الغرض ان کی شخصیت پر لکھنے کی کئی جہتیں ہیں اور ان میں سے ہر جہت اہم ہے، مگر فی الحال ہمارے پیش نظر ان کا ایک خاص کتابچہ ہے، جس کا علم ان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہوا اور چوں کہ یہ ایک اہم علمی چیز ہے؛ اس لیے اس پر کچھ لکھنے کی بھی خواہش ہوئی، اس کتابچے کا نام ''**الفارق بین المصنف والسارق**'' ہے، یہ ایک عرصے سے نایاب تھا، پھر ایک مخطوطے کی شکل میں بغداد کے مکتبۃ الاوقاف العامہ میں پایا گیا، اس کا ایک خطی نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں بھی ہے، اس مخطوطہ کو مشہور عراقی ڈپلومیٹ، شاعر وادیب اور عراقی مصنفین واہلِ قلم کی انجمن کے سابق سربراہ ہلال ناجی نے حاصل کرکے اپنی تحقیق وتخریج کے ساتھ شائع کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: ہمیں یہ نادر مخطوطہ بغداد کے مکتبۃ الاوقاف العامہ میں مخطوطات کے ایک مجموعے کے ضمن میں ملا، اس پر کتابت کرنے والے کا نام درج نہیں ہے اور اسے منسوب علامہ سیوطی کی طرف کیا گیا ہے، اس کا سالِ کتابت محرم 977ھ (جون 1569ء) درج ہے اور نام ''**رسالة في**

سرقة كتب المؤلفين" لکھا گیا ہے، آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر انھوں نے اس رسالے کی علامہ سیوطی کی جانب نسبت کی صحت اور اس کا نام "الفارق بين المصنف والسارق" ہونے پر متعدد دلیلیں پیش کی ہیں، جو مختصراً یوں ہیں:

۱۔ رسالے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس میں ایک ایسے شخص کے بارے میں گفتگو کی ہے، جس نے ان کی کتاب "الخصائص" (نبی اکرم ﷺ کی خصوصیات کے تذکرے پر مشتمل تصنیف) اور "المعجزات" (آپؐ کے معجزات کی تفصیلات پر مبنی کتاب) سے سرقہ کر کے ایک دوسری کتاب لکھی تھی، سرقہ کرنے والا ان کا ایک معاصر تھا، جس نے ان کی یہ دونوں کتابیں ان کے بعض شاگردوں سے حکمراں خانوادے کے بعض افراد کے ذریعے سفارش کے ذریعے منگوائیں اور پھر بغیر حوالے کے ان کے مضامین کو اپنی کتاب میں شامل کرلیا۔

۲۔ اس مخطوطے میں ایک ایسا جملہ لکھا گیا ہے، جو سیوطی کی "الخصائص" میں بھی موجود ہے "لقدأقمت في تتبع هذه الخصائص عشرين سنة إلى أن زادت على الألف" (میں نے ان خصوصیات کی تلاش وجستجو میں بیس سال صرف کیے، یہاں تک کہ ان کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی) اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس مخطوطہ کے مصنف سیوطی ہیں اور اس کا نام "الفارق بين المصنف والسارق" ہے۔

۳۔ اس مخطوطے میں نبی اکرم ﷺ کی ایک خصوصیت کا ذکر چھیڑا گیا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شریعت وحقیقتِ اشیا دونوں کا علم دیا تھا، اس خصوصیت کا ذکر سیوطی نے اپنی کتاب "الخصائص" میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور اس پر ایک دوسرا کتابچہ "شعلة النار" کے نام سے بھی انھوں نے لکھا تھا۔

۴۔ مخطوطہ کے مصنف نے اپنے بارے میں بتایا ہے کہ وہ "روضہ" میں قیام پذیر ہے اور یہ معلوم ہے کہ علامہ سیوطی نے اپنی آخری زندگی روضہ میں گزاری اور وہیں ان کی وفات بھی ہوئی تھی؛ بلکہ اس پر ان کی ایک کتاب بھی ہے "كوكب الروضة في تاريخ جزيرة الروضة"۔

۵۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں سیوطی کی تالیفات کے ضمن میں "الفارق..." کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ اسماعیل بغدادی نے بھی ہدیۃ العارفین میں "الفارق..." کو سیوطی کی کتابوں میں شمار کیا ہے۔

۷۔ کتانی نے علامہ قسطلانی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: میرے پاس ایک عجیب وغریب مقالہ ہے، جسے حافظ سیوطی نے صاحبِ ترجمہ (قسطلانی) کے تعلق سے تحریر کیا تھا، اس کا نام الفارق بين المصنف والسارق ہے، شیخ جاراللہ بن فہد کی روایت ہے کہ علامہ قسطلانی نے بعد میں علامہ سیوطی سے تصفیہ کا ارادہ کیا تھا اور وہ قاہرہ سے علامہ سیوطی کے پاس روضہ گئے، ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، انھوں نے اندر سے آواز لگائی: کون؟ تو قسطلانی نے جواب دیا: میں قسطلانی ہوں، ننگے پاؤں، ننگے سر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں؛ تاکہ میری طرف سے آپ کا دل صاف ہوجائے، تو انھوں نے کہا: تمھارے تئیں میرا دل صاف ہوگیا لیکن نہ گھر کا دروازہ کھولا، نہ ان سے ملاقات کی۔ (فہرس الفہارس والأثبات، ص:969، شذرات الذہب، ج:8، ص:121-122، ط:مکتبۃ القدسی، مصر1351ھ)

۸۔ کشف الظنون میں جہاں علامہ سیوطی کی تصانیف کے ضمن میں "الخصائص" کا تذکرہ ہے، وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ: کہتے ہیں کہ اس کتاب کو ان کے ایک معاصر نے اپنی طرف منسوب کرلیا تھا، جس کے خلاف سیوطی نے "الفارق بين المصنف والسارق" کے نام سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ (ج:1، ص:205-206، ط:داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان)

اس رسالے کے شروع میں ہلال ناجی نے علامہ سیوطی کی زندگی اور علمی وتصنیفی سرگرمیوں پر ایک مختصر، مگر قیمتی مقدمہ لکھا ہے، اس کے علاوہ جگہ جگہ معلومات افزا حاشیے لگائے ہیں

اور اخیر میں علامہ سیوطی کی تمام تالیفات کی ایک فہرست بھی مہیا کی ہے،جس کے مطابق علامہ سیوطی کی تمام تصانیف و تالیفات کی تعداد 799 رتک پہنچتی ہے۔ان کی ان گراں قدر تحقیقات و تخریجات کے ساتھ یہ کتابچہ پہلی بار ''عالم الکتب'' نامی بیروت کے نشریاتی ادارے سے 1998ء میں شائع ہوا ہے، 65 رصفحات پر مشتمل ہے۔

علامہ سیوطی کے سوانح نگاروں نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مزاج و نہاد کے اعتبار سے ذرا سخت تھے اور بعض مخصوص وجوہات کی بنا پر اپنے معاصرین میں سے کم ہی لوگوں کو تسلیم کرتے یا ان کی تعریف کرتے تھے، اِس رسالے میں انھوں نے سرقہ کرنے والے کے خلاف جو زبان استعمال کی ہے، اس میں غیر معمولی ترشی ہے، لب و لہجہ تنبیہی، زجر و توبیخ سے مملو اور سخت ترین ہے، رسالے کا آغاز آیتِ کریمہ ''إن اللّٰه يأمر أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها'' (النساء:4) سے ہوا ہے اور اسی سے انھوں نے واضح کرنا چاہا ہے کہ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے مالی امانتوں کے حوالے سے یہ حکم دیا ہے کہ جس کی امانت ہو، اسے لوٹا دیا جائے، اسی طرح معنوی، علمی امانتوں پر بھی یہ اصول نافذ ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص لکھنے پڑھنے کے مہتم بالشان عمل میں کہیں سے کوئی استفادہ کرتا ہے، تو اس آیتِ کریمہ کے بہ موجب اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تحریر یا تقریر میں مستفاد منہ کا حوالہ دینے کا اہتمام کرے، پھر اصل متن یوں شروع ہوتا ہے:

هل أتاك حديث الطارق، وما أدراك ماالطارق؟الخائن السارق،والمائن المارق،الذي توصل إلينا بأولاد الحنفاء،وتوصل إلينا بأبناء الخلفاء،فأوسعناه بشرا،فقابله بجفا،وعاملنا بغدر إذ عاملناه بوفا،وتطفل علينا في الموائد،فأنعمنا له بشيء ممالدينا من الفوائد،وأذنا لطلبتنا أن يسمحوا له بإعارة مصنفاتنا الدرر الفرائد،إكراما لمن تشفع به من بني العباس،وإبرام الحبل ودادهم الذي هو عندنا محكم الأساس،وتفاديا لرد شفاعة هذه السلالة الذين هم رؤوس الأشراف وكواهل الناس،فما كان من هذا العديم الذوق إلا أنه نبذ الأمانة وراء ظهره وخان،وجنى ثمار غروسنا وهو فيما جناه جان،وافتض أبكار عرائسنا اللائي لم يطمثهن في هذا العصر إنس قبلنا ولا جان،وأغار على عدة كتب لنا أقمنا في جمعها سنين''. (ص:33)

(آپ کو رات کے وقت دستک دینے والے کی کچھ خبر ہے؟ آپ کو کیا پتا کہ وہ کون شخص ہے، وہ ایک خائن، چور، جھوٹا اور بد اطوار انسان ہے، جس نے کچھ شریف زادوں اور ابنائے خلافت کے ذریعے ہم تک پہنچنے کی کوشش کی، تو ہم نے اس کا خوش دلی سے استقبال کیا، جبکہ اس نے تنگ دلی کا مظاہرہ کیا، ہم نے اس سے وفاداری کی، تو اس نے بے وفائی کی، ہمارے دسترخوان (علم) پر طفیلی بن کر آیا، تو ہم نے اسے نوازا اور اپنے طلبہ کو اجازت دی کہ وہ اسے ہماری یکتا موتی جیسی کتابیں بہ طور عاریت دے دیں، یہ دراصل ہم نے ان لوگوں کے احترام اور ان کے ساتھ اپنے مضبوط تعلقات کو استوار کرنے کے مقصد سے کیا، جن سے اس نے سفارش کروائی تھی، ہم یہ چاہتے تھے کہ ان اَشراف و اہلِ قیادت کے خانوادے کی سفارش رد نہ کریں، مگر اس بے ذوق انسان نے امانت داری کو پس پشت ڈال دیا اور بدعہدی کی، اس نے مجرمانہ انداز میں ہمارے پودوں کا پھل توڑا، اس نے ہماری ایسی باپردہ (علمی) خواتین کی بکارت زائل کردی، جنھیں اس سے پہلے نہ تو کسی انسان نے ہاتھ لگایا تھا، نہ کسی جن نے، اس نے ہماری کئی ایسی کتابوں پر دھاوا بول دیا، جن کی ہم نے کئی سالوں میں جمع و تالیف کی تھی)

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ اس شخص نے میری دو کتابوں ''المعجزات'' اور ''الخصائص'' (مطول و مختصر) میں سے سرقہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ یہ چیزیں ''میں

نے تلاش کی ہیں، میں نے جمع کی ہیں اور مجھے ملی ہیں'' حالاں کہ میں نے گزشتہ بیس سال سے مسلسل اپنے مطالعہ اور کتابوں کی تحقیق کے ذریعے خصائصِ نبوی کی تلاش وجستجو کی، یہاں تک کہ میرے علم کے مطابق حضور اکرم ﷺ کے خصائص کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ علامہ سیوطی کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے خصائصِ نبوی ﷺ کی تلاش میں تفسیر، حدیث، ان کی شروحات، چاروں فقہی مسالک کی فقہ، اصول فقہ اور تصوف وسلوک کے علاوہ دیگر موضوعات کی کتابوں کی تحقیق کر کے ان خصائص تک رسائی حاصل کی۔ اس کے بعد ان کا دعویٰ ہے کہ اس موضوع پر سب سے بڑی اور جامع کتاب علامہ نووی (676-631ھ) کی ''روضۃ الطالبین وعمدۃ المتقین'' ہے، مگر اس میں میری کتاب کے بالمقابل دس فیصد خصائص بھی بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس موضوع پر میرا مطالعہ اب بھی جاری ہے اور میں مزید اضافوں کی کوشش میں ہوں، پھر وہ سارق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس شخص نے میری کتاب سے لفظ بہ لفظ سرقہ کیا ہے اور افسوس ہے کہ اس نے لکھا ہے کہ یہ خصوصیاتِ نبوی میں نے خود تحقیق کر کے حاصل کیے ہیں، حالاں کہ یہ جھوٹ ہے اور اس نے میری کتاب سے نقل کیا ہے۔ (ص:34)

سرقہ پر علامہ سیوطی نے کئی دلیلیں بھی دی ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ جہاں جہاں میں نے کسی مسئلے کے بیان کو مبہم رکھا ہے، وہاں اس شخص نے بھی مبہم اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ اسی طرح علامہ سیوطی نے کتاب عاریت پر دینے کے بعد اس میں مزید دو خصوصیات کا اضافہ کیا تھا، چوں کہ یہ اضافے اس شخص کے ہاتھ نہیں لگ سکے؛ اس لیے پہلے انھوں نے جتنے خصائص کا ذکر کیا تھا، اس نے اتنے ہی پر انحصار کر لیا۔

اس کے بعد انھوں نے تصنیف وتالیف کے سلسلے میں کچھ اصول کی طرف اشارہ کیا ہے، اولاً ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

''**تناصحوا في العلم؛ فإن خيانة أحدكم في علمه كخيانته في ماله**'' (جامع الصغیر للسیوطی، رقم الحدیث:3350)

(علم کے سلسلے میں نصیحت پکڑو؛ کیوں کہ تم میں سے کسی کا علم میں خیانت کرنا مال میں خیانت کرنے کے برابر ہے)

اس حدیث سے تصنیف وتالیف کے باب میں استدلال ایسا ہی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کردہ امانت والی آیت سے اور اس میں تو حضور ﷺ نے صراحت فرمادی ہے کہ جس طرح مال میں خیانت درست نہیں ہے، حرام ہے، اسی طرح علم کے سلسلے میں بھی خیانت کرنا حرام ہے، اب اس علمی خیانت کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، جن میں سے ایک کا ذکر تو اسی حدیث کے اس حصے میں مذکور ہے، جسے علامہ سیوطی نے یہاں حذف کر دیا ہے، وہ حصہ یہ ہے ''**ولا يكتم بعضكم بعضا**'' یعنی تم میں سے کوئی کسی سے اپنے علم کو نہ چھپائے، اگر کوئی صاحبِ علم ہے، تو وہ دوسروں کو اپنے علم سے فائدہ پہنچائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اپنے علم کو چھپاتا ہے، تو گویا وہ علمی خیانت کرنے والا ہے! علامہ سیوطی یہاں اس حدیث کے ایک دوسرے مفہوم کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں، وہ یہ کہ کسی کی بات کو بغیر حوالہ دیے نقل کر دینا بھی علمی خیانت ہے اور ایسا کرنے والا اس حدیث کے مطابق ایک ناجائز اور حرام عمل کا ارتکاب کر رہا ہے اور اس کے لیے وہی وعیدیں ہیں، جو امانت میں خیانت کرنے والوں کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

اس کے بعد علامہ سیوطی نے ایک اثر بھی نقل کیا ہے ''**بركة العلم عزوه إلى قائله**'' (علم کی برکت اس میں ہے کہ اسے اس کے اصل قائل کی طرف منسوب کیا جائے) یہ قول کس صحابی کا ہے، اس کی صراحت نہیں کی ہے، ہلال ناجی حاشیے میں لکھتے ہیں ''**لم أظفر به**'' یہ قول انھیں کہیں دوسری جگہ نہیں ملا، اسے علامہ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم (ج:2، ص:922) میں لفظوں کی قدرے تبدیلی کے ساتھ بہ طور مقولہ ذکر کیا ہے (**يقال: إن من بركة العلم أن تضيف الشيء إلى قائله**) بہر کیف

بات باوزن ہے اور علامہ سیوطی نے اثر کے طور پر ہی کہیں پڑھا یا سنا ہوگا؛ اس لیے نقل کیا ہے۔

اس کے بعد عظیم محدث و فقیہ اسماعیل بن یحیٰ مزنی، امام الحرمین، عبدالکریم بن محمد الرافعی وغیرہ کے طرزِ تصنیف و تالیف سے استدلال کیا ہے کہ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں جہاں بھی کسی کا قول نقل کیا ہے، تو اس کا حوالہ دیا ہے، حتی کہ امام مزنی نے اپنی ''مختصر'' کا آغاز امام شافعی کے انداز سے کیا، تو انھوں نے لکھا: **کتاب الطھارۃ، قال الشافعي: قال اللّٰہ تعالیٰ: وأنزلنامن السماء ماء اً طھورا** ۔ظاہر ہے کہ یہ آیت انھیں براہِ راست قرآن پاک میں مل جاتی اور وہ سیدھے طور پر ''قال اللہ'' سے اپنی بات شروع کر سکتے تھے، مگر چوں کہ یہ طریقہ ان سے قبل امام شافعی نے اختیار کیا تھا؛ اس لیے انھوں نے امام کا حوالہ دینا ضروری سمجھا، اسی طرح امام نووی نے بدعت کی تقسیم کے سلسلے میں اپنے معاصر عزالدین بن عبدالسلام (۵۷۸ - ۶۶۰ھ) کی کتاب ''قواعدالاحکام'' سے استفادہ کیا، تو باقاعدہ ان کا نام لے کر اس کی وضاحت کی۔ (ص:37)

پھر لکھتے ہیں کہ کوئی بھی مصنف، چاہے وہ جس دور کا بھی ہو، اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا، یا تو وہ قرآن و حدیث سے استفادہ کر کے کوئی اصول وضع کرتا ہے، پھر اس پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتا ہے یا وہ کسی پہلے سے موجود مسئلے پر ایسی آیت یا حدیث سے استدلال کرتا ہے، جس کی طرف پہلے کسی کا دھیان نہ گیا ہو، خصائصِ نبوی ﷺ اسی دوسری قسم کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، پہلے ایک طبقے نے احادیث و آیات کی روشنی میں نبی پاک ﷺ کی خصوصیات کو جمع کیا اور ان پر کتابیں لکھی، پھر بعد میں بھی مختلف لوگوں نے قرآن و حدیث کے ذخیرے سے نبی اکرم ﷺ کے ایسے خصائص دریافت کیے، جہاں تک پہلے لوگوں کی رسائی نہیں ہو سکی تھی؛ لیکن کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ یہ سمجھ کر کہ یہ خصوصیات تو آیات و احادیث میں موجود ہی تھیں، ان کا استخراج کرنے والے ائمۂ سابقین کا نام گول کر جائے؛ بلکہ علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے ہر خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے اسے مستنبط کرنے والے کا حوالہ دینا چاہیے، ائمۂ سلف کا یہی طریقہ رہا ہے اور اسی طرح انسان کا علمی وقار و اعتبار قائم ہوتا ہے۔ (ص:38)

علامہ سیوطی اس کے بعد اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب میں احادیث اور آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں بہت سی ایسی خصوصیاتِ نبوی ﷺ کا ذکر کیا ہے، جو اس سے پہلے اس موضوع کی کتابوں میں مذکور نہیں تھیں اور ان کے نقل میں میں نے ائمۂ سابقین و مجتہدین کے طرزِ عمل کو اختیار کیا ہے، جہاں سے جس حدیث کی تخریج کی ہے، اس کا حوالہ دیا ہے اور اگر کسی روایت کی اصل تک نہیں پہنچ پایا، تو جہاں وہ روایت ملی ہے، اس کا حوالہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ عبدالرحیم بن علی بن حسن اِسنوی (772-704ھ) نے اپنی کتاب ''المہمات'' میں اپنے شاگرد زین الدین عراقی (806-725ھ) سے نقل کیا ہے اور حوالے کے ساتھ نقل کیا ہے، اس سے استاذ اور شاگرد دونوں کے بلند مرتبہ ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے استاذ حافظ ابن حجر عسقلانی (852-773ھ) کے طرزِ عمل کا اہتمام سے حوالہ دیتے ہیں، لکھتے ہیں کہ جب حافظ صاحب اپنے طلبا کو پڑھاتے اور دورانِ درس کسی کی روایت کردہ حدیث نقل کرتے یا اس کی تخریج کا حوالہ دیتے اور اس کی اصل کا انھیں علم نہ ہوتا، تو وہ اپنے شاگردوں سے کہتے کہ آیندہ جب تم اپنے شاگردوں کو پڑھانا یا اس روایت کو تحریری طور پر نقل کرنا تو یوں کہنا ''**رواہ فلان أوخرج فلان بإفادۃ شیخنا ابن حجر**'' کہ میرے شیخ راستاذ ابن حجر کے واسطے سے فلاں کی روایت یا تخریج مجھ تک پہنچی ہے۔ علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ حافظ صاحب ایسا غایت درجہ علمی احتیاط و دیانت داری کے زیر اثر اور خیانت و بددیانتی سے بچنے کے لیے کرتے تھے، حدیث و قرآن کی تعلیمات بھی یہی ہیں اور ظاہر ہے کہ جس نے کوئی تحقیق پہلے

کی ہے اور آپ اس سے استفادہ کر رہے ہیں، تو اول الذکر کا حق ہے کہ آپ اس کے تئیں احسان شناسی کا ثبوت دیں، اپنی تقریر و تحریر میں اس کا حوالہ دیں، اس کی افضلیت و اولیت کو تسلیم کریں، اس سے آپ کے علم میں برکت بھی ہوگی اور اس کی نافعیت کے امکانات بھی بڑھ جائیں گے۔

ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ کی چوری کبھی بھی پکڑی جاسکتی ہے اور پھر آپ کو بسا اوقات ذلت و شرمندگی کا بھی سامنا کرنا پڑسکتا ہے یا جس کا مال آپ نے چوری کیا ہے، اس کی بددعاؤں کی زد میں آپ آسکتے ہیں، اس سلسلے میں علامہ سیوطی نے تین واقعات نقل کیے ہیں، ایک امام ابوحامد اسفرائینی (406 - 344ھ) کا، جسے علامہ تاج الدین سبکی (771-727ھ) نے نقل کیا ہے کہ ایک مجلس میں کسی کے بارے میں یہ ذکر آیا کہ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں، تو امام اسفرائینی نے کہا: لاؤ، ذرا میں بھی اس کی کتابیں دیکھوں، جب انھوں نے دیکھا، تو پتا چلا کہ وہ ساری کتابیں خود امام اسفرائینی کی تصانیف سے سرقہ شدہ تھیں، یہ دیکھ کر امام اسفرائینی کا ماتھا ٹھنکا اور انھوں وہیں اس پر بددعا کی: **بتر كتبي، بتر الله عمره**'' کہ اس شخص نے میری کتابوں سے کاٹ چھانٹ اور چوری کر کے اپنی کتابیں تیار کیں، اللہ اس کی زندگی کو کاٹ چھانٹ کر مختصر کردے، لوگوں نے دیکھا کہ وہ شخص چند سال بعد ہی وفات پا گیا اور اس علمی مقام و مرتبے سے محروم رہا، جو اس کے بہت سے معاصرین کو حاصل ہوا۔ دوسرا واقعہ امام ابوشامہ عبدالرحمٰن بن اسماعیل (665-599ھ) نے لکھا ہے کہ ان کی کتاب ''البسملۃ'' سے کئی سارے خطیبوں نے بلاحوالہ لفظ بہ لفظ نقل کر کے کتابیں مرتب کیں؛ چنانچہ ان سارقین کی کتابوں سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا اور وہ بے نام و نشان ہی رہیں۔ ایک تیسرا واقعہ حافظ ابن حجر کا بیان کیا ہے کہ ان کے ایک بڑے شاگرد نے ان سے تاج الدین سبکی کی ''طبقات الشافعیۃ الکبری'' پڑھنے کے لیے مانگی، ان کے پاس اس کا جو نسخہ تھا، اس پر انھوں نے جا بجا حاشیہ چڑھایا تھا، اصل کتاب پر اپنے مطالعہ و معلومات کی روشنی میں اتنا اضافہ کیا تھا کہ وہ ایک مستقل تصنیف کی شکل اختیار کر سکتا تھا، ابن حجر نے اپنے اس ''بڑے شاگرد'' کو وہ کتاب پڑھنے کے لیے دے دی، وہ کتاب لے کر گئے، اصل کتاب سے جو کچھ تلخیص و ترمیم کرنی تھی، کی، مگر اس کے ساتھ ہی اس پر ان کے استاذ نے جو حواشی چڑھائے تھے، انھیں بھی جوکا توں اٹھالیا اور بغیر حوالہ دیے اپنی کتاب ''**اللمع الألمعية لأعيان الشافعية**'' (یہ سبکی کی طبقات کی تلخیص تھی) میں نقل کر دیا، جب حافظ صاحب کو یہ معلوم ہوا، تو انھوں نے خط لکھ کر ان کی کلاس لگائی اور لکھا کہ ''**فقد حرمت بذلك خيرا كثيرا، وفضلا كبيرا**'' (تم اپنے اس عمل کی وجہ سے خیر کثیر اور انعامات و افضالِ الٰہی سے محروم رکھے جاؤ گے) سیوطی لکھتے ہیں: ''**فوالله ماطلعت لتلك الطبقات طالعة، ولا رآها أكثر الناس، ولا طرق خبرها مسامعهم، وهكذا سنة الله فيمن أغار على كتب المصنفين، ولم يؤد الأمانة من المؤلفين، أن يخمل ذكره، وذكر كتابه، ويعدم النفع به في الدنيا إلى يوم مآبه**''. (ص: 42-40)

(بخدا اس طبقات (یعنی جسے حافظ ابن حجر کے اس شاگرد نے مرتب کیا تھا) کو کوئی قبولیت نہ حاصل ہوئی، نہ اکثر لوگوں نے اسے دیکھا، نہ اس کے بارے میں سنا اور جو شخص دوسرے مصنفوں کی کتابوں پر ڈاکہ ڈالتا اور علمی بددیانتی کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ اسے اور اس کی کتاب کو گم نام و بے نشان کر دے اور قیامت تک کے لیے اس کی نافعیت کو ختم کر دے) مرتب نے حافظ ابن حجر کے اس شاگرد کی تعیین قطب الدین محمد بن محمد الخیضری سے کی ہے اور علامہ سخاوی کی ''الضوء اللامع'' کے حوالے سے مذکورہ بالا واقعے کی نشان دہی کی ہے۔

پھر وہ اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ سرقہ کرنے والے نے صرف میری مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے ہی

سرقہ نہیں کیا ہے؛ بلکہ اس نے میری ایک تیسری کتاب ''طي اللسان عن ذم الطيلسان'' سے بھی سرقہ کیا ہے اور اسے بھی اس طرح پیش کیا ہے، گویا وہ اس کی اپنی تحقیق اور مطالعوں کا نتیجہ ہو، سیوطی کا الزام آگے یہ ہے کہ اس شخص نے انہی تین کتابوں پر بس نہیں کیا؛ بلکہ ان کی ایک چوتھی کتاب ''مسالك الحنفافي والدي المصطفى'' سے بھی سرقہ کیا ہے، البتہ اس مؤخرالذکر کتاب سے پہلی تینوں کتابوں کے بالمقابل کم چوری کی ہے۔ پھر اس نے صرف میری کتابوں کے سرقہ پر ہی انحصار نہیں کیا؛ بلکہ قاضی قطب الدین خضیری اور شمس الدین سخاوی کی کتابوں سے بھی سرقے کیے ہیں۔

لکھتے ہیں کہ جب اس بندے کو لکھنے کی صلاحیت نہیں تھی، تو کیا ضرورت تھی کہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کرتا، میری اور دیگر مصنفین کی کتابوں سے سرقہ کرکے اس نے یہ سوچا کہ فائدے میں رہے گا، مگر حقیقت میں وہ خسارے میں رہے گا، اس نے سوچا ہوگا کہ اس طرح وہ علمی و تصنیفی دنیا میں بڑا نام کمائے گا، مگر یہ تو سراسر بدنامی کا سودا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس شخص کے بارے میں بتایا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا، البتہ کسی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ ماوراء النہر کے خطے سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے میری ''الخصائص'' اور ''المعجزات'' کی کئی کاپیاں میرے شاگرد عبدالجبار سے حاصل کیں، بہت دن تک انھیں اپنے پاس رکھے رہا اور ان میں سے چوریاں کرتا رہا اور عبدالجبار کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں لگ سکا، پھر مصر واپسی کے بعد اس نے میرے اس شاگرد سے ان کتابوں کی بقیہ کاپیاں بھی مانگیں، جن کو دینے سے اس نے انکار کیا، پھر جب اس نے بار بار اصرار کیا اور کئی بڑے لوگوں سے سفارشیں کروائیں، تب اس نے باقی کاپیاں بھی اسے دے دیں اور اس نے میری پوری کتاب سے سرقہ کرلیا۔ دوسری دو کتابیں ''أنموذج اللبيب في خصائص الحبيب'' (پورا نام أنموذج اللبيب في خصائص الحبيب ہے، یہ الخصائص الکبریٰ کی تلخیص ہے) اور ''طي اللسان عن ذم الطيلسان'' اس نے ان کے دوسرے شاگرد نورالدین الحسنی سے لیں اور ان کتابوں سے بھی سرقہ کیا۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ جب ادب و شعر کے باب میں، جو فضیلت و مرتبے کے اعتبار سے سیرت جیسے موضوع سے یقیناً کم تر ہے، اس میں سرقہ نویسی کو برداشت نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی شاعر یا ادیب کہیں سے سرقہ کرتا ہے، تو اس کی سرزنش کی جاتی ہے، اس کی ملامت کی جاتی اور اسے عار دلایا جاتا ہے، تو سیرت جیسے متبرک علمی موضوع پر سرقہ نویسی کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے شمس الدین محمد بن حسن نواجی (859-788ھ) کی کتاب ''الحجة في سرقات ابن حجة'' کا حوالہ دیا ہے، یہ کتاب انھوں نے اپنے دور کے معروف ادیب؛ بلکہ امام الادبا ابوبکر بن علی تقی الدین الحموی (837-767ھ) کے خلاف لکھی تھی اور ان پر ادبی سرقوں کا الزام لگایا تھا، کہتے ہیں کہ بعد میں جب انھیں مزید تحقیق ہوئی، تو اپنے الزامات سے رجوع کرلیا تھا، اس کتاب کی ضخامت تین سو صفحات سے زائد ہے اور یہ مخطوطہ کی شکل میں جامع ازہر کی لائبریری میں موجود ہے، اس کا پی ڈی ایف ورژن www.alukah.net پر بھی ڈال دیا گیا ہے، دوسرے نمبر پر علامہ سیوطی نے قاسم بن محمد البصری حریری (516-446ھ) کی مشہور زمانہ ''مقاماتِ حریری'' کے تئیسویں مقامہ ''الشعرية'' کی ایک فصل نقل کی ہے، جس میں ابوزید سروجی اپنے ایک شاگرد کا قضیہ لے کر والیِ حکومت کے پاس پہنچتا ہے اور اپنے شاگرد پر الزام لگاتا ہے کہ میں نے اس کی تعلیم و تربیت کی اور اسے بچپن سے پرورش کرکے جوان کیا، پھر جب یہ بڑا ہوگیا، تو مجھ پر ہی ظلم و زیادتی کرنے لگا، شاگرد کو یہ سن کر حیرت ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے: حضور! میں تو آپ کا فرماں بردار شاگرد ہوں اور کبھی میں نے آپ کے ادب و احترام میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، تو استاذ کہتا ہے: اس سے بڑی نافرمانی، عیب اور برائی کیا ہوسکتی ہے کہ تم نے میری کتاب اپنے نام سے

چھپوالی، میرے اشعار چوری کرکے اپنے نام سے نشر کردیے، تمھیں معلوم نہیں کہ شعرا کے لیے ان کے اشعار کی چوری سونے چاندی کی چوری سے بھی زیادہ اندوہناک ہے، وہ اپنے افکار و خیالات کی بے حرمتی کے تئیں ایسے ہی باغیرت ہوتے ہیں، جیسے اپنی کنواری بیٹیوں کی بے حرمتی کے تئیں۔ یہ سن کر والیِ حکومت اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ہلاکت ہوتمھارے لیے، تم تو ایک بدکردار فاضل اور ایک چور شاگرد ہو!

سیوطی نے ناصرالدین حسن بن شاور کنانی (687-608ھ) کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے:

سارق الشعر على الأبيات عاد أي عاد
وهو لص آمن من قطع كف في فساد
إنما قطع يديه قطعكم عن الأيادي

(اشعار چوری کرنے والا شخص پرلے درجے کا ظالم ہے، یہ ایسا چور ہے، جس کا چوری کرکے فساد پھیلانے کی وجہ سے ہاتھ بھی نہیں کاٹا جاسکتا، پس اس کا ہاتھ کاٹنے کی شکل یہی ہے اسے انعامات واکرامات سے محروم رکھا جائے)

ایک واقعہ شہاب الدین ابن الخیمی انصاری یمنی (685-603ھ) کا نقل کیا ہے، جو اپنے زمانے کے مشہور صوفی شاعر تھے، انھوں نے ایک خانقاہ میں قیام کیا اور وہاں بیٹھے بیٹھے ایک نظم لکھی، جب وہاں سے نکلے، تو اپنی نظم وہیں بھول گئے، اتفاق سے ان کے بعد وہاں ایک دوسرے صاحب نجم الدین بن اسرائیل ابوالمعالی شیبانی (677-603ھ) نے قیام کیا، انھیں وہ نظم مل گئی؛ چنانچہ انھوں نے اسے اپنے نام سے پھیلادیا، جب شہاب الدین یمنی کو معلوم ہوا، تو وہ طیش میں آگئے، دوسرے ادیبوں، شاعروں سے اس کا ذکر کیا اور معاملہ عمر بن فارض (632-576ھ) تک پہنچا، جو اس وقت استادشعرا میں شمار ہوتے تھے اور صوفیانہ شاعری میں امامت کے درجے پر فائز تھے، سلطان العاشقین کے لقب سے جانے جاتے تھے، انھوں نے دونوں سے کہا کہ اپنی اپنی نظم سنائیں، دونوں نے سنائی، تو انھیں اندازہ ہوگیا کہ نظم اصل میں ابن الخیمی کی ہے اور نجم الدین بن اسرائیل نے چوری کی ہے؛ چنانچہ انھوں نے ابن الخیمی کے حق میں فیصلہ سنادیا، یہ سن کر نجم الدین نے کہا: یہ تو توارد ہے، تو انھوں نے کہا کہ: شروع سے آخر تک توارد تو نہیں ہوتا، یہ چوری ہے! (ص:50-47)

اس کے بعد پھر علامہ سیوطی نے اپنی کتاب سے سرقہ کرنے والے کو کھری کھوٹی سنائی ہے اور اصحابِ تصنیف وتالیف کو نصیحت کی ہے کہ ایسے لوگوں سے اپنی کتابوں کو چھپا کر رکھیں، ان کے ہاتھ نہ لگنے دیں اور ساتھ ہی جو شخص بھی ایسی علمی چوری میں پکڑا جائے، تو بے تحاشا اس کا پردہ فاش کریں؛ تاکہ کوئی دوسرا آیندہ ایسی بددیانتی کی جرأت نہ کرسکے اور اگر کوئی ایسے شخص کی حمایت میں کھڑا ہو، تو اس کی بھی چتھاڑ کریں؛ تاکہ کوئی کسی غلط کام کرنے والے کی حمایت میں کھڑا ہونے کی ہمت نہ کرے۔ ایک بات اور لکھتے ہیں کہ جب اسے (سارق کو) ایک شخص نے اس چوری کی طرف متنبہ کیا، تو اس نے ایک دومقام پر ''الطیلسان'' اور ''المسالک'' کے حوالے دیے، مگر ''المعجزات'' اور ''الخصائص'' کا حوالہ نہیں دیا اور حوالہ بھلا کیا دیتا کہ اس نے تو میری دونوں کتابیں پوری کی پوری نقل کررکھی ہیں۔ اگر اس کے پیش نظر دیانت و امانت کے تعلق سے اسلامی ہدایات و تعلیمات ہوتیں، تو ایسا نہ کرتا، اسی طرح اگر اس نے مال و دولت کمانے کے لیے یہ حرکت کی ہے، تو بھی اس کے پیش نظر اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہونا چاہیے تھا کہ ''وہ رزاق ہے''۔ پھر کہتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر مبہم اندازِ بیان اختیار کیا ہے، جس کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ بعض قارئین کو ان مقامات پر اشکال پیدا ہو، میں تو اس اشکال کے جواب سے واقف ہوں؛ لیکن جس شخص نے چوری کرکے کتاب تیار کی ہے، اگر اس کے سامنے کسی نے اشکال کیا، تو وہ کیا جواب دے سکے گا؟ اس کے بعد ایسے ہی ایک مسئلے پر بحث کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو علمِ شریعت وحقیقت دونوں کا کلی علم تھا یا نہیں، اس

بارے میں قدرے طویل گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ اس سارق سے پوچھنا چاہیے کہ "وجمعت لہ علم الشریعة والحقیقة" (یہ سیوطی کی الخصائص کی عبارت ہے اور وہیں سے ناقل نے اٹھایا تھا) کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے، جبکہ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیا کو شریعت کا تو کلی علم ہوتا ہے؛ لیکن حقیقتِ اشیا کا علم نہیں ہوتا؟ اس کا انھوں نے تفصیلی جواب دیا ہے، جس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔

پھر اپنے موضوع پر لوٹتے ہوئے لکھتے ہوئے ہیں کہ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ اس نے جو کچھ میری کتابوں سے نقل کیا تھا، اسے میری طرف منسوب کرنے کو آمادہ ہوگیا تھا، مگر بعض لوگوں نے اسے گمراہ کیا اور اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ تم نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے اور حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ حرکت اس نے علامہ سخاوی کی کتابوں کے ساتھ بھی کی تھی، جس کی انھیں خبر لگ گئی، تو انھوں نے زبردست پھٹکار لگائی اور دھمکی دی، جس کے بعد اس نے اپنی حرکت سے رجوع کرلیا، لکھتے ہیں کہ ایک عجیب واقعہ یہ رونما ہوا کہ اس نے خلیفہ متوکل علی اللہ (903-819ھ) کے سامنے حلفیہ کہا کہ اس نے میری کتابیں دیکھی تک نہیں ہیں، حالاں کہ اس نے سارا مواد میری کتابوں سے سرقہ کیا ہے۔

اخیر میں لکھتے ہیں کہ اس سارے حادثے کے باوجود اگر وہ شخص اپنی خیانت سے توبہ کرلے، تو میں اسے معاف کردوں گا، اگر اسے میری مزید کسی کتاب کی ضرورت ہوگی، تو میں اسے دینے کے لیے تیار ہوں، اگر میری کسی بات کو اسے سمجھنے میں پریشانی ہوگی، تو اسے سمجھا سکتا ہوں اور میری کتابوں سے نقل کرنے میں جہاں جہاں اس سے غلطی ہوئی، اس کی اصلاح بھی کردوں گا؛ لیکن اگر وہ اپنی خیانت وعلمی بدعہدی پر قائم رہا اور اپنے اس جرم پر اصرار کیا، تو میری نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں، وہ ایک جاہل اور خائن انسان ہے، میرے بس میں ہو، تو اس کی پیشانی پر لکھ دوں: "إن اللہ لا یھدي کید الخائنین" (یوسف:12) اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے مکر وفریب کو کامیاب نہیں کرتا۔

پس نوشت:

اس پورے کتابچے سے چند چیزیں معلوم ہوتی ہیں: یہ کہ علمی سرقے کی روایت کوئی نئی نہیں ہے، بہت پرانی ہے اور اُس زمانے سے جاری ہے، جب مسلم اربابِ فکر وتحقیق اور اہلِ تصنیف و تالیف کی بہ دولت انسانی دنیا میں علم وتحقیق کا دور اپنے عروج پر تھا اور یہ سرقے علم وادب وفکر کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی سے صادر ہوتی رہتے تھے۔ سیوطی نے جن لوگوں کا ذکر بہ طور علمی سارق کیا ہے، وہ سب اپنے دور میں معمولی لوگ نہیں تھے، علم وادب کے شعبے میں نام دار وکام دار تھے اور ان کی شہرت بھی تھی، مقاماتِ حریری کے ایک تمثیلی واقعے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ادبی سرقوں کے واقعات سامنے آتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ایسا کرنے والوں کی تنبیہ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ سیوطی نے اپنی کتابوں کے سرقوں کی جو بات کی ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ ان کی کوئی تخلیقی تصنیف یا عبارت نقل کرنے والے نے بغیر حوالہ نقل کردی تھی؛ بلکہ وہ احادیث و آثار تھے، جو انھوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی خصوصیات کے تعلق سے اپنی کتابوں میں جمع کیے تھے، ظاہر ہے کہ وہ انھوں نے بھی کسی نہ کسی کتاب یا محدث سے نقل کیے ہوں گے؛ لیکن چوں کہ وہ نقل کرنے میں سبقت کرنے والے تھے اور ان کے خیال میں دوسرے نے ان کی کتابوں سے ہی وہ روایات نقل کی تھیں؛ اس لیے بعد میں جو شخص نقل کررہا تھا، اس کی دیانت داری کا تقاضا تھا کہ وہ سیوطی کے حوالے سے اس اولین منقول عنہ کا ذکر کرتا۔ وہ ناقل کون تھا؟ اس سلسلے میں مصنفین ومحدثین کے سوانحِ حیات پر مشتمل کتابوں میں عموماً ارشاد الساری والے علامہ شہاب الدین قسطلانی کا نام آتا ہے، کشف الظنون، شذرات الذہب اور فہرس الفہارس والأثبات وغیرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ سیوطی اور

قسطلانی کا یہ معاملہ شیخ الاسلام زکریا انصاری (926-823ھ) کے پاس پہنچا، تو انھوں نے سیوطی سے کہا کہ آپ اپنا مدعا بیان کیجیے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے اپنی کتابوں میں بیہقی کے حوالے سے خصائصِ نبوی ﷺ کے سلسلے میں ایسی روایات نقل کی تھیں، جو مجھ سے قبل اور کسی نے نقل نہیں کیں، مگر انھوں نے اپنی تالیفات میں میرا حوالہ دیے بغیر براہِ راست بیہقی کے حوالے سے ان روایات کو پیش کیا ہے، حالاں کہ مجھے یقین ہے کہ ان تک میری کتابوں سے قبل بیہقی کی وہ روایات نہیں پہنچی ہوں گی۔ ایک واقعہ جو پہلے ذکر بھی کیا جا چکا ہے کہ اخیر میں قسطلانی نے علامہ سیوطی سے معاملے کو رفع دفع کرنے یا ان سے معافی مانگنے کا ارادہ کیا اور ان کے گھر ''روضۃ المقیاس'' پہنچے، مگر انھوں نے دریافت کرنے کے بعد اندر ہی سے انھیں جواب دے کر رخصت کر دیا کہ میرا دل تمھاری طرف سے صاف ہو چکا ہے، اس سے بھی لوگوں نے یہ طے کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ رسالہ سیوطی نے انہی کے بارے میں لکھا ہے، پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عمل علامہ قسطلانی نے اپنی کسی ایک تصنیف میں کیا یا کئی کتابوں میں وہ ایسا کر چکے تھے؟ شیخ الاسلام زکریا انصاری والے واقعے کے ضمن میں صاحبِ شذرات الذہب نے تو مطلق لکھا ہے کہ ''سیوطی علامہ قسطلانی کی تحقیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ان کی کتابوں سے بغیر حوالہ دیے نقل کرتے رہتے ہیں'' (ج:8،ص:122) البتہ اِس رسالے کے مرتب نے نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کتاب ''المواهب اللدنية'' تھی، جو پہلی بار 899ھ میں شائع ہوئی، اس میں جو معجزات و خصائصِ نبوی ﷺ کے ابواب ہیں، انہی کے بارے میں سیوطی کا الزام تھا کہ قسطلانی نے ان کی کتابوں سے نقل کیے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ قسطلانی کی یوں تو دسیوں تصانیف ہیں، مگر سب سے زیادہ مقبولیت اسی کتاب کو حاصل ہے، سیرت کے موضوع پر مستند مراجع میں شمار کی جاتی ہے اور علما کی جانب سے اس کی تلخیص و تشریح و ترجمہ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

علامہ سیوطی، جیسا کہ ہم نے پہلے ان کے سوانح نگاروں کے حوالے سے لکھا ہے نہایت زود رنج، تند مزاج اور معاصرین کو تسلیم کرنے کے حوالے سے حد درجہ بخیل واقع ہوئے تھے؛ چنانچہ ہمیشہ وہ کسی نہ کسی کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے بولتے رہتے تھے، ایک دوسرے معاصر اور معروف محدث و مؤرخ علامہ شمس الدین سخاوی سے بھی ان کی علمی جھڑپیں رہیں، سخاوی نے بھی انھیں نہیں چھوڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ سخاوی نے الضوء اللامع (ج: 4، ص: 65-70) میں تفصیل سے سیوطی پر تحریری حملے کیے اور ان پر اساتذہ و شیوخ کی بے احترامی اور علمی سرقے کا الزام لگایا، لکھا کہ انھوں نے بہت سی پرانی کتابوں کو، جو گم نام ہو گئی تھیں، اپنی طرف منسوب کر کے چھپوا لیا ہے، ظاہر ہے کہ سیوطی کہاں خاموش رہنے والے تھے، انھوں نے کسی لحاظ کے بغیر ان پر بھی حملے کیے اور باقاعدہ ایک کتابچہ ''الكاوي في تاريخ السخاوي'' لکھ کر ان پر بھی کئی علمی الزامات لگائے، پھر یہ سلسلہ انہی دونوں تک محدود نہ رہا، ان کے شاگرد و معتقدین بھی میدانِ کارزار میں آ گئے اور دونوں کے مدح و ذم میں کئی مقالے، کتابچے اور رسالے لکھے گئے، ان تمام لوگوں کے نام اِس کتابچے کے مرتب ہلال ناجی نے اپنے مقدمے میں گنوائے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک خاص بات قابلِ غور یہ ہے کہ علامہ سیوطی کا یہ رسالہ حقوقِ تصنیف و تالیف پر قانونی و فقہی حیثیت سے بحث کرنے والی اولین باضابطہ تحریر ہے؛ کیوں کہ انھوں نے یہ رسالہ پندرہویں صدی عیسوی میں لکھا تھا، جبکہ ادبی و فکری حقوق کے تحفظ پر پہلا عالمی معاہدہ، جو ''معاہدۂ برن'' کے نام سے مشہور ہے، وہ ستمبر 1886ء میں عمل میں آیا اور اس کے اگلے سال دسمبر سے اس کا نفاذ شروع ہوا اور اس موضوع پر باقاعدہ ایک تنظیم سرگرم ہوئی، فی الوقت دنیا بھر کے ممالک سے اس کے 176 رکن ممبران ہیں۔

بلکہ مزید تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ایک

سیوطی ہی نہیں ،ان کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں نے اُسی دور میں اوراس سے پہلے بھی مختلف کتابوں میں ضمناً ہی سہی علمی سرقے کا ذکر کیا اور علمی و تصنیفی دیانت داری کی اہمیت کو اجاگر کیا۔محمد ابن اسحاق الندیم (وفات:384ھ) نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''الفہرست'' (طبع اول:377ھ) میں مختلف مقامات پر ایسی چودہ کتابوں کا ذکر کیا ہے،جن میں علمی وادبی سرقہ پر بحث کی گئی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ساری کتابیں تیسری، چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں،انھوں نے اسی کتاب میں کئی ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے،جنھوں نے علمی یا ادبی سرقے کا ارتکاب کیا۔اس مضمون کی تکمیل کے دوران ہی مجھے ایک صاحب نوراللہ فارانی (پاکستان) نے علامہ سیوطی کے ایک اور مقالے کی طرف متوجہ کیا،اس کا نام ''البارق في قطع السارق'' ہے، جسے ڈاکٹر عبدالحکیم انیس نے اپنی تحقیق،تخریج ،حواشی اور قیمتی علمی اضافوں کے ساتھ ادارۃ البحوث دبئی سے 2012ء میں شائع کروایا ہے،136/صفحات پر مشتمل یہ کتاب بھی زبردست ہے اور اس میں علامہ سیوطی نے سرقہ نویسی پر علمی، تاریخی،فنی واصولی بحث کی ہے، انھوں نے سرقہ کی تین قسمیں قرار دی ہیں:اول احادیث سرقہ کرنے والے،جن کا تذکرہ ابن حبان ،عقیلی اور ابن الجوزی نے اپنی اپنی ''کتاب الضعفاء'' میں،ابن عدی نے ''الکامل'' میں اور امام ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں کیا ہے،دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو مختلف الموضوع کتابوں میں سے ایک حصہ یا بہت بڑا حصہ یا پوری کتاب ہی چوری کر کے اپنے نام سے شائع کر دیتے ہیں،ایسے بہت سے لوگوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ان میں ایسے ایسے نام ہیں،جنھیں ہم نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور علمی دنیا ان کی تحریروں اور کتابوں پر صدیوں سے اعتبار کرتی آرہی ہے،تیسری قسم ان لوگوں کی بیان کی ہے،جنھوں نے اشعار کی چوری کی، پھر ان کی دو قسمیں کی ہیں،اول جنھوں نے شعرا کے خیالات چرائے اور اپنے الفاظ میں انھیں بیان کیا،دوم ایسے شعرا،جنھوں نے لفظ و خیال دونوں چوری کر لیے،اس فہرست میں عربی کے بڑے بڑے شعرا مثلاً بحتری، متنبّی، ابوالعتاہیہ، بشار بن برد، عمر بن ابی ربیعہ، حطیئہ، ابن رشیق، جریر اور فرزدق شامل ہیں۔اس کتاب کے محقق نے اس کا سالِ تصنیف 901ھ لکھا ہے،اس میں اچھا خاصا مواد ''الفارق بین المصنف والسارق'' کا بھی شامل ہے اور اخیر میں علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ایک صاحب نے میری چار کتابوں سے بہت سا مواد چوری کر کے اپنی کتاب میں شامل کر لیا،جس کی نشان دہی کے لیے میں نے ''الفارق بین المصنف والسارق'' لکھی ہے۔(البارق،ص:111)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے جس رسالے کا جائزہ لیا ہے، وہ پہلے لکھا گیا،اس کے بعد علامہ سیوطی نے اصولی و تاریخی حیثیت سے سرقہ نویسی پر گفتگو کرنے کے لیے ایک علیحدہ مقالہ لکھا،جس کا نام ''البارق علی قطع السارق'' رکھا،محقق نے دعویٰ کیا ہے کہ انھیں اس کے تین خطی نسخے مدینہ منورہ اور قاہرہ سے ملے،جبکہ ایک چوتھا نسخہ لیڈن کے کتب خانے میں بھی موجود ہونے کے بارے میں انھیں پتا چلا ہے، بہرکیف انھوں نے اپنی گراں قدر تحقیق و تخریج کے ذریعے اس عظیم علمی سرمایے کو دنیا کے سامنے لاکر اہلِ علم پر بڑا احسان کیا ہے،جس کے لیے وہ شکریے کے مستحق ہیں۔

اس طرح کی چیزیں ہمارے مطالعے میں رہنی چاہئیں؛ تاکہ ہم خود بھی علمی اخلاقیات سے متصف ہوں،ساتھ ہی اپنے اندر یہ جرأت بھی پیدا کریں کہ اگر کسی سے جان بوجھ کر علمی بد دیانتی کا صدور ہو رہا ہے،تو فوراً اس کی نشان دہی کریں،ایسا کرنے والے کی حوصلہ شکنی کریں اور تحریری وتقریری طور پر ایسے لوگوں کو بے نقاب کریں؛ تاکہ تصنیف وتحقیق جیسے عملِ عالی کی آبرو قائم رہے۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: مدارس کی تعلیم (عصری تعلیم اور سماجی کردار کے معاصر تقاضوں کی روشنی میں)
مصنف: ڈاکٹر فہیم اختر ندوی
صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۱۲۰ روپیہ
ناشر: ہدایت پبلیشر اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی۔
مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زیر نظر کتاب عصر حاضر کے ایک ایسے حساس موجوع پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے، جس کے بارے میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ موضوع اب ''حدیث المجالس'' ہوگیا ہے، ہر عام وخاص اس موضوع پر شعوری یا غیر شعوری طور پر لکھ رہا ہے اور بول رہا ہے، اس امر کو یوں ہی نظر انداز کر دینا اور یہ کہہ کر گذر جانا کہ ''جس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا وہ مدارس پر گرجتا اور برستا ہے''، انتہائی خطرناک ہوگا، اس رویہ سے مستقبل کے تاریک ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے، اس موضوع پر گفتگو کی کثرت پر عدم اخلاص کا لیبل لگانے سے بہتر ہے کہ اس کو اس زاویہ سے دیکھا جائے، کہ یہ ایک سماجی ضرورت ہے، جس کا اظہار ہو رہا ہے، ایک اضطراب ہے جو ظاہر ہو رہا ہے، ایک چیز کی اہمیت مسلم ہے اسی لیے اس پر گفتگو ہو رہی ہے۔

زیر نظر کتاب کے مضامین کا مرکزی موضوع ایک ہے، اگر چہ ہر مضمون میں الگ الگ پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے، ایسے مجموعۂ مضامین پر تبصرہ دشوار بھی ہوتا ہے اور تفصیل کا طالب بھی، بہر حال یہ مضامین ایک ایسے صاحب فکر وقلم کی طرف منسوب ہیں جس کی ایک عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے، ڈاکٹر فہیم اختر ندوی مصنف بھی ہیں اور مصنف گر بھی، علم و دانش میں ان کی مثال دی جاتی ہے، انھوں نے قدیم مدرسی نظام تعلیم سے خوب سیرابی حاصل کی ہے، جدید تعلیم کے مراکز میں بحیثیت طالب علم ایک عرصہ گزارا ہے، اب وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے سربراہ ہیں، علمی اور فکری حلقوں میں ان کی شخصیت معروف ومسلم ہے، ان کے یہاں بھرتی کی چیزیں نہیں ہوتیں، ان مضامین میں بھی علمی گہرائی، فکر وشعور کی آگہی اور عصری تقاضوں سے واقفیت نمایاں ہے، صلابت رائے، قدیم صالح اور جدید نافع کا توازن، سماجی ضروریات اور قومی ترقی کے لیے علم کی ضرورت ان مضامین میں صاف نظر آتی ہے، یہ مضامین ایک ایسے صاحب فکر کے قلم سے نکلے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں انتہائی متدین، متواضع، خوش اخلاق، ملنسار، علم دوست اور اہل علم کا قدردان ہے، جو علم کی اصل، علم کی اہمیت، علم کی نوعیت، علم کے مقصد، قدیم وجدید اداروں کے مقاصد ونتائج اور ضروریات کا محرم راز ہے، جو حالات، وقت، ضرورت، تقاضوں اور علوم وفنون کی اپنی اپنی جگہ اہمیت کا بخوبی واقف ہے، جس کے یہاں خلط مبحث کا شائبہ نہیں گذرتا، جو محض تسکین نفس کے لیے لکھنے کا عادی نہیں، جس کی جدوجہد اور کم گوئی معروف ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سلیم الطبع، صحیح الفکر اور معتدل فکر کا حامل ہے، کسی ایسے شخص کے قلم سے ایسی فکر انگیز تحریروں پر کان نہ دھرنا قومی محرومی ہی کہلائے گی، ان مضامین میں ڈاکٹر فہیم اختر ندوی نے ملی ضرورت پر گفتگو کی ہے، اصحاب شعور کا درد پیش کیا ہے، ملت کے فکری اضطراب اور تعلیمی ڈھانچہ کی بے حیثیتی پر گفتگو کی ہے، اس لیے میں اگر یہ لکھوں کہ انھوں نے ان مضامین میں اپنے سوزِ دروں کو نکال کر رکھ دیا ہے تو بات ذرا چھوٹی ہوگی۔

فہیم صاحب کی فکرِ رسا اور ان کے ادراک کا اندازہ کرنے کے لیے یہ سطریں ملاحظہ کیجئے:

''پچھلے لمبے زمانہ سے مسلم سماج کے اندر علم کی غلط عملی تقسیم اور علم وتحقیق کے مجموعی زوال نے مسلمانوں کو حاشیہ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ وہ علم دینے والے تو کجا، علم لینے والے بھی اپنے معروف معیار کے مطابق نہ رہ پائے۔ اب تعلیم کی ترقی اور دینی روح کا اظہار دونوں محاذ، مسلم فکر وتوجہ کا مستحق بن گئے ہیں۔ اور مستقبل کا کوئی عروج ان دونوں میدانوں میں کامیابی کے بغیر متوقع نہیں ہوسکتا ہے۔ برصغیر اور بالخصوص ہندستان میں دینی تعلیم کا محاذ سنبھالنے والے مدارس نے صدی سے اوپر کا تجربہ مکمل کرلیا ہے۔ یہ طویل عرصہ ایک نئی منصوبہ بندی کے لئے کافی سے بہت زیادہ ہے۔ کچھ یہی صورت حال عصری تعلیم کے مسلم منظر نامہ کی ہے''۔ (ص ۵-۶)۔

ڈاکٹر فہیم اختر ندوی نے اس کتاب میں علم کے حصول اس کی اشاعت اور تعلیم کے مقصد پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، انھوں نے ''اسلام میں تصور علم کی جامعیت'' پر استدلالی گفتگو کی ہے، غلط اور مروجہ تقسیم کی غلطی واضح کی ہے، نافعیت وعدم نافعیت کے معیار کی وضاحت کی ہے، مذہبی تعلیم اور عصری تعلیم کے دو متوازی نظاموں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے، دونوں کے نفع ونقصان پر روشنی ڈالی ہے، انھوں نے ملک کی ترقی میں دینی مدارس کی شراکت داری کے احساس کو بھی پیش کیا ہے اور دینی مدارس ی عصری ہم آہنگی پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے جابجا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، کہ ملت کا مستقبل تعلیمی ڈھانچہ کا مرہون منت ہوتا ہے اور ہمارا موجودہ تعلیمی ڈھانچہ اضطرابی کیفیت سے دوچار ہے، واقعہ یہ ہے کہ دینی تعلیم کے حاملین ملکی نظام اور قومی دھارے میں کہیں جگہ نہیں پا سکتے، ان کی سلطنت مسجد کے محراب ومنبر اور زیادہ سے زیادہ مدرسہ کی چہار دیواری میں محدود ہوتی ہے،، ملکی نظام، سماجی اثر و رسوخ اور سیاسی قیادت عصری تعلیم کے فارغین کے حصہ میں آتی ہے، جو بڑی حد تک دینی وملی شعور سے خالی ہوتے ہیں، نتیجتاً ہم دو متوازی نظام رکھتے ہوئے بھی ملک وسماج میں اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں، فہیم صاحب کی یہ فکر انگیز سطریں ملاحظہ کیجئے:

''حالیہ دنوں میں ملک کے اندر بڑی تیزی سے آرہی تبدیلیوں نے بھی ارباب فکر ونظر کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، اور ان کے اندر شعور کی انگڑائی لیتی آہٹیں محسوس کی جارہی ہیں، دینی مدارس کی عصری شراکت، ان کے فارغین کا تعلیمی معیار، وہاں سے نکلنے کے بعد ان کی عصری تعلیم کے مسائل، سماج سے ان کے ربط وضبط کی دشواریاں، مسلم سماج کی معاصر ضرورتوں کے تناظر میں ان کا کردار، عصری تعلیم کے اداروں میں مسلم طلبہ کی دین سے وابستگی، دینیات کی تعلیم کے عملی انتظامات، نئی نسل کی اسلامی شعوری تربیت اور اسلامی تہذیب سے ان کی وابستگی اور اس کی قدر وقیمت سے کماحقہ آشنائی، جدید معاشرہ میں مسلم طلبہ کے دینی تعلیمی رول اور اس جیسے موضوعات آج سنجیدہ اور تجزیاتی غور وفکر کا شدید تقاضا کرتے ہیں''۔ (ص ۶)۔

سچی بات یہ ہے کہ مصنف نے ان مضامین میں دل کے تار چھیڑے ہیں، فکر ونظر کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے، دعوت فکر وعمل دی ہے، انھوں نے تدریب افتا کے نصاب کو معاصر تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، ملکی عدالتی نظام میں اسلامی قانون کی تفہیم کے حوالے سے بڑی معنی خیز بحث کی ہے، ''مقاصد شریعت اور معاصر تدریس وتحقیق'' کو موضوع بنایا ہے، عصری تقاضوں، منصوبہ بندی، جدید چیلنجز، مشکلات ومواقع اور دینی تعلیم کی اہمیت پر اس قدر پر مغز بصیرت افروز، چشم کشا اور سلیم لفکر مضامین کا یکجا ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا، اس خاص پہلو کو سامنے رکھیے تو اس کتاب کی خوبی دوبالا ہوجائے گی کہ اس کے مضامین زمینی حقائق اور عملی تجربات پر مشتمل ہیں، محض لفاظی اور

نظریاتی گفتگو سے کام چلانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

اس موضوع پر متعدد بار راقم سطور اظہار خیال کر چکا ہے، اور اب یہ کتاب ایک مدلل دستاویز کی شکل میں سامنے آئی ہے، جو اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ مدارس کو عصری آگہی سے آشنا کیا جائے، معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، ساتھ ہی عصری اسکولوں میں دینی تعلیم، فکری اور دینی تربیت کو یقینی بنایا جائے، یہ دونوں ہی کام ہمارے بچوں کے لیے اسی قدر ضروری ہیں جس قدر دوا اور غذا، تعلیمی نظام میں پائی جانے والی غلط تقسیم کو ختم کرنے کی عملی شکل کیا ہو اور عملاً اس غلط روایت کو کیسے ختم کیا جائے یہ ایک سوال بہر حال باقی رہ جاتا ہے؟ ہمارے ندوے کے سابق معتمد تعلیمات نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ جب مسلمان علوم کی اس غلط تقسیم کو ختم کر لیں گے تو پھر سے وہ عہد نور وعروج میں پہنچ جائیں گے۔ بنیادی تعلیم سے اس تقسیم کو عملاً کیسے ختم کیا جائے، دین و دنیا کی فرنگی تقسیم سے نجات کیسے حاصل کی جائے، اس کے جواب کے لیے یہ کتاب بہت کچھ رہنمائی کرتی ہے، ضرورت ہے کہ اہل علم اس کا استقبال کریں اور اس موضوع کو آگے بڑھائیں، اس کے عملی خاکے پیش کریں تا کہ اس طرح ملت کے مستقبل کی تعمیر میں کچھ نئی پیش رفت ہو۔

☆

نام رسالہ: نقوش طیبات (مولانا محمد غزالیؒ نمبر)
ایڈیٹر: مولانا ناصر سعید اکرمی
صفحات: ۷۲۶
ناشر: معہد الامام حسن البناء الشہید بھٹکل۔
مبصر: محمد سہیل ندوی

کل نفس ذائقة الموت، موت کا مزہ ہر جاندار کو چکھنا ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں، ہر جن و بشر اور جاندار کو اس سے گزرنا لازمی امر ہے، لیکن جو لوگ کسی مشن یا تحریک سے مربوط ہوتے ہیں، اور اس سے وابستگی کو اپنا سامانِ زیست سمجھ لیتے ہیں، ان کو کتنی ہی طویل عمر دیدی جائے، ان کی جدائی وفرقت نفس پر بار ہی گزرتی ہے، اور بہت طویل عرصہ بھی بہت مختصر سا لگتا ہے، داعی الی اللہ مولانا غزالی ندویؒ کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہوتا ہے۔

زیر نظر نقوش طیبات دو ماہی کا یہ خصوصی شمارہ مولانا غزالی ندویؒ کی حیات و خدمات پر مشتمل ہے، یہ شمارہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، چوں کہ اس کے اندر بہت سے اہم اہل علم حضرات نے مولانا مرحوم کے تعلق سے بہت کچھ لکھا ہے، ان مضامین کے اندر مولانا مرحوم کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کا آنا بھی ضروری تھا، تا کہ ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے، کسی نے مولانا مرحوم کی ذاتی اور گھریلو زندگی سے متعلق باتیں درج فرمائی ہیں، تو وہیں دوسری طرف بعض مضامین سے ان کی علم دوستی اور دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں مر مٹنے اور فنائیت کا جذبہ بھر پور جھلکتا ہے، بہر کیف اس شمارہ کے تمام مضامین ہی بڑی اہمیت اور قابل قدر نگاہوں سے دیکھے جانے کے لائق ہیں، اور قابل ستائش اور لائق استفادہ بھی، خاص طور سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم، اور مولانا سید سلمان الحسینی ندوی کی تحریریں بڑی گراں قدر ہیں۔ لیکن اگر انہیں جیسے اہل نظر وباریک بیں حضرات کی تحریروں پر اکتفا کیا جاتا اور بیجا طوالت و ضخامت سے اجتناب کیا جاتا تو یہ شمارہ تمام تر اختصار کے باوجود بھی جامع اور معلومات افزا ہوتا، اور اس سے استفادہ مزید آسان تر ہو جاتا، ہمارے اس دور کا المیہ یہ ہے کہ لوگ پڑھنے سے اور اچھی چیزیں پڑھنے سے بہت بھاگتے ہیں، اس صورت میں بے جا ضخامت خود بھی فرار کا سبب بنتی ہے، اس خاص نمبر میں بھی اگر متعدد مضامین شامل نہ ہوئے تو اس کی شان میں اضافہ ہوتا اور یہ از خود باعث کشش ہوتا، موجودہ صورت میں بھی اصحاب ذوق اور اہل دین کے لیے اس میں کشش کا سامان

خوب موجود ہے وہ اس سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں، اور اس خاص نمبر کے ممدوح کی زندگی کے جذبۂ صادق اور منور پہلوؤں سے اپنی زندگیوں کو سنوار سکتے ہیں۔

دراصل یہ شمارہ سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں فہرست مضامین ہے، دوسرے باب میں پیغامات ہیں، تیسرے باب میں اکابرین کے خطوط کو شامل کیا گیا ہے، چوتھے باب میں مولانا کی خوشنما تحریروں کے چند نمونے پیش کئے گئے ہیں، پانچویں باب کو مرثیوں سے مزین اور آراستہ کیا گیا ہے، چھٹے باب میں خطابات اور حیاۃ الصحابہ کے دروس کو شامل کیا گیا ہے۔ پھر ساتواں اور آخری باب دعوت وتبلیغ کے ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ یہ خاص نمبر اپنے موضوع کو نہ صرف محیط بلکہ کافی ضخیم ہے۔ اور علمائے دین کی مخلصانہ تحریروں سے مزین ہے۔ مضامین میں تنوع بھی کافی حد تک ہے۔ زبان اور انداز بیان عمدہ اور بہت سہل ہے۔ مولانا محمد ناصر سعید اکرمی ناظم معہد الامام حسن البناء بھٹکل کی ادارت میں نکلنے والا یہ خصوصی شمارہ عام لوگوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصاً مولانا مرحوم سے تعلق رکھنے والوں اور ان کی طرف انتساب رکھنے والوں کے لئے کیوں کہ اس میں بہت ساری وہ باتیں منظر عام پر آگئیں ہیں، جو اس سے پہلے شاید ان کے علم میں نہ ہوں۔

مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی ایک بلند مقصد اور عالی ہدف کے ساتھ گزاردی، اور اس کے اثرات بھی مرتب ہوئے، اس اعتبار سے یہ شمارہ لائق تحسین ہے، اس کو ظاہری و باطنی دونوں اعتبار سے معیاری بنانے کی کوشش کی گی ہے، یہ ان کے جانب سے صدقہ جاریہ ہے، اور آئندہ نسلوں کے لئے بڑا گراں قدر تحفہ ہے۔ اللہ اس نمبر کو مفید سے مفید تر بنائے۔ اور مولانا مرحوم کو کروٹ کروٹ سکون نصیب فرمائے۔ اور ان کے بے لوث جذبہ کو عام فرمائے۔ آمین۔

☆

نام کتاب: کتاب حکمت
مصنف: پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
مرتب: پرویز عالم
ناشر: براؤن پبلیکیشنز نئی دہلی
مبصر: محمد پاشا ندوی

زیر نظر کتاب پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف مواقع سے قرانیات، ادبیات جیسے موضوعات پر اسی طرح بعض مضامین تحقیق وتجزیہ کے طور پر ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ جن کو ان کے سعادت مند وہونہار شاگرد ڈاکٹر پرویز نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، قرآنیات جناب کا خاص موضوع ہے، اس کے علاوہ ادبیات اور مطالعہ سرسید پر آپ کی نگارشات کو اہل علم وادب کی یہاں عام مقبولیت حاصل ہے، زیر نظر کتاب "کتاب حکمت" چار ذیلی عناوین پر مشتمل ہے جس میں پہلا تفسیر وتشریح ہے، اس میں مختلف موضوعات کی شکل میں قرآنی آیات کے مختلف گوشوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، مثلا "صلاۃ قرآن کی روشنی میں" اس میں تمام عبادات میں نماز کی اساسی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے، کہ نماز ہی وہ عبادت ہے جو جذبہ عبودیت اور تمام عبادات کو بجالانے اور خدا کی جانب سے مطلوب تمام حقوق کی ادائیگی کا شوق پیدا کرتی ہے۔ اس کے بغیر تمام عبادات بے معنی ہیں۔" صحیح نمازیں انسان کے اندر جذبہ فروتنی کو نمودیتی ہیں، اور خشیت الہی کے عناصر کو پروان چڑھاتی ہیں، نماز اور تقویٰ ساتھ ساتھ چلتے ہیں، نماز کے باوجود اگر انسان کے اندر بردباری اور صالحیت پیدا نہ ہو تو گویا نمازیں بے اثر ہیں، نماز ذہنی خلجان اور دماغی خلل کو دور کرتی ہے، بندے کو کیف ونشاط کے کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔

اسی طرح ایک عنوان "سورہ الم نشرح چراغ ظلمت" ہے، جس میں اس پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم مایوسی کا دشمن

ہے اور صبر وتحمل ایمان کی علامت ہے۔اس آیت کریمہ سے یہ نکتہ بھی ابھرتا ہے کہ جو دل ایمان واسلام کی دولت سے مالا مال ہو اسے طمانینت سکینت ضرور نصیب ہوگی، اس کے دل میں رنج وغم کا شائبہ تک نہ ہوگا۔اس سورہ کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ایک مومن اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتا ہے مایوسی اسلام میں کفر ہے، بڑے سے بڑے مسائل کا حل اللہ کا کام ہے، کوہ الم کو خوشگواریوں میں تبدیل کرنا اللہ کا کام ہے۔

اسی طرح "بشارت عیسیٰ علیہ السلام" کے عنوان سے حضرت عیسیٰ کی صفت بشارت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس موضوع سے متعلق قرآن کی آیات پیش کر کے اللہ کی طرف سے حضرت عیسی کے مبشر ہونے کی حکمت پر روشنی ڈالی گئی ہے، کہ حضرت عیسی کا مبشر ہونا دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہتمام ہے، "یہاں مبشر کے لفظ پر غور کرنے کی شدید ضرورت ہے، بشارت کسی ایسی چیز کی دی جاتی ہے جس میں طمانینت وسکینت ہو، جسے سن کر انسان باغ باغ ہو جائے، اور اس بشارت میں اسے اپنا اقبال اور خوبصورت مستقبل نظر آئے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسی ہی پرکشش اور باعث اشتیاق تھی"، "یہاں یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کا ایک واضح مفہوم یہ ہے کہ اس کے بعد یہودیت وعیسائیت کا سلسلہ ختم ہوا، ان دونوں مذاہب کی تمام خوبیاں دین اسلام میں سمٹ آئیں، کیونکہ یہودیت وعیسائیت میں وہ آفاقیت وعالمگیریت نہیں جو اسلام میں ہے، دین قیم کا یہی مطلب ہے"۔

دوسرے جزء میں تین ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں، ان میں پہلا عنوان "فساد فی الارض عہد حاضر میں" ہے، اس عنوان کے تحت ملت اسلامیہ کی حالت، باہمی فتنہ وفساد اور اس کی تنزلی کی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی روشنی میں امت کو دعوت دی گئی ہے کہ ایسی صورت حال میں ملت کے نمائندگان کا فریضہ ہیکہ وہ اس کو خلفشار سے نکالیں، ملی مفادات کو ذاتی مفادات ومسائل پر مقدم رکھیں، اور اس جہان فانی میں قیام امن کی استمراری کوشش کریں، امت کی باہمی رنجشوں کو کالعدم قرار دینے میں لگ جائیں۔فساد فی الارض کی مختلف شکلوں کا ذکر کر کے عصر حاضر پر اس کا کس طرح انطباق ہو رہا ہے، اس کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے، اسی تناظر میں مفسدین کی نشاندہی کی گئی ہے، کہ امریکہ رئیس المفسدین ہے، انگلینڈ کی مفسدانہ سرگرمیاں کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں اور انہیں مفسدین کی پشت پناہی میں فلسطینیوں کی خانمابربادی اور نسل کشی میں اسرائیل اپنا گھناونا کردار ادا کر رہا ہے"۔

چند اصول "تفسیر اور معروف مفسرین" کے عنوان سے وحی، کیفیت وحی، اسباب نزول، محکم اور متشابہ کی تفصیل اور اس سلسلے میں علمائے مفسرین کی آراء، ناسخ منسوخ کی بحث، نسخ کی لغوی اور اصطلاحی حیثیت، اقسام قرآن، امثال قران، دور اول کے اہم مفسرین اور اہم کتب تفسیر کا تعارف تحقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

"مدرسہ الاصلاح میں تدریس قرآن" کے عنوان سے ابناء مدرسۃ الاصلاح کی قرآنی خدمات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، کہ مدرسہ الاصلاح میں تدریس قرآن کی بنیاد دراصل فکر فراہی پر ہے، مولانا فراہی متقدمین سے لے کر عصر حاضر تک مطالعہ قرآن کے باب میں امتیازی حیثیت کے مالک رہے ہیں، "مولانا فراہی کا ماننا ہے" کہ متقدمین کے فہم قرآن کو من وعن قبول کرنے کے بجائے اس کا تحلیلی وتنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ردوقبول کا نظریہ قائم کیا جائے۔اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عنایت اللہ، خالد مسعود پروفیسر الطاف اعظمی وغیرہ کی قرآن کے باب میں نمائندہ خدمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مزید یہ کہ ان تمام کی فکر دراصل مدرسۃ الاصلاح اور مولانا فراہی سے مستفاد اور ان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

"قران کریم کا تصور انسانیت" کے عنوان کے تحت دین

اسلام کی آفاقیت ، ہمہ گیریت اور اس کی کشش و ہمہ جہتی کو اجاگر کیا گیا ہے، کہ " قرآن کا ہر حکم فلاح انسانیت کی ضمانت ہے، وہ انسانوں کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے، قسطاس مستقیم کے ذریعے معاشرتی اوصاف کے تئیں اپنا حکم ثابت کرتا ہے، دنیا میں ظلم وتشدد اور قتل وخونریزی کی جڑیں کاٹ کر اسے امن وآشتی اور فرحت وانبساط کا گہوارہ بنانے کا خواستگار ہے، ہر انسان اس کے نزدیک مکرم ومحترم، اس کی عزت وآبرو کی حفاظت کی ذمہ داری اور اس کے درد کا درماں تلاش کرنا اس کا فریضہ ہے"۔

" تفسیر نظام القرآن: سورہ بقرہ میں کلام عرب"، " کلام اقبال میں قرآنی آیات" پہلے عنوان کے تحت مولانا حمید الدین فراہی کے اشعار عرب کو بطور استدلال و استشہاد کے پیش کرنے کے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے، مزید ان کی تفسیر نظام القرآن سورہ کی تفسیر میں مستعمل اشعار کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے عنوان " کلام اقبال میں قرآنیات " سے اقبال کی شاعری میں قرآنی اسرار ورموز کو پیش کیا گیا ہے، کہ انہوں نے کتاب الٰہی کو اپنا رہنما اور چراغ راہ بنایا تھا ان کی شاعری کا بڑا حصہ قرآن سے مستفاد ہے " فکر اقبال کی تاسیس وتعمیر میں اسی صحیفۂ ہدایت کا بنیادی رول رہا ہے، چاند کے سارے حسن وجمال کا منبع ومنہل آفتاب ہے اور وہ اسی سے اکتساب نور کرتا ہے، اگر یہ منبع نہ ہو تو چاند کی تمام رعنائیاں اور جلوہ آرائیاں بجھ جائیں، ٹھیک یہی حال فکر اقبال کا ہے، علامہ اقبال کی شاعری نے مختلف جہتوں سے قرآن کریم کے تاثر وتفکر کو قبول کیا ہے۔ کلیات اقبال میں ایسے بے شمار اشعار ہیں جو آیات کے تراجم پر مبنی ہیں۔

" مستشرقین اور انگریزی تراجم قرآن تنقیدی جائزہ " پروفیسر عبدالرحیم قدوائی جنہوں نے قرآن کو اپنا خاص موضوع بنا کر اسکے مختلف پہلوؤں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور متعدد تصانیف میں مباحث قران کے تعلق سے عصر حاضر کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کی ہے۔ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے اس کتاب کا بہتر انداز میں تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ نہایت جامع انداز میں مترجم کے ابعاد واحساسات کو اجاگر کرتے ہوئے خصائص وتراجم کی توضیح اچھے طرز پر کی گئی ہے''۔

اسی طرح اس مجموعہ مضامین کا آخری موضوع ہندو پاک کے مشہور اسلامی محقق ومصنف اور معروف اسکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات قرآنی کا تنقیدی جائزہ ہے، کہ ''مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ رائے مبنی بر مبالغہ نہیں کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اولین مصادر قرآنیات کا بامعان نظر مطالعہ کیا، ان بارہ خطبات میں قرآنی مراجع ومنابع کا ایک قیمتی ذخیرہ آگیا ہے''

کتاب حکمت کے مذکورہ تمام مشمولات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف نے اپنی ہر تحریر کی اساس قرآن کریم پر قائم کی ہے، یوں تو یہ مجموعہ مضامین پورا کا پورا معلومات اور علمی ادبی نکات سے پر ہے اگر چہ بعض تحریروں میں مصنف کی بعض آراء سے قاری کو اختلاف ہو تو اس کا قوی امکان ہے، کیونکہ وہ ان کی ذاتی آراء ہیں، جبکہ بعض عبارتوں اور جملوں میں مبالغہ کا احساس بھی ہوسکتا ہے کیوں کہ مسنف کے اسلوب تحریر میں اس عنصر کی جھلک جا بجا نظر آجاتی ہے، اسی طرح کہیں کہیں احادیث نبویہ کے حوالوں کی خلش شدت سے محسوس ہوگی کہ قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ اگر اس موضوع سے متعلق موجود صحیح احادیث کے حوالہ جات سے تحریر کو مزین کیا جاتا تو مضامین کی اہمیت وافادیت دوبالا ہو جاتی ، اسی طرح بعض نظریاتی چیزیں تحقیق طلب معلوم ہوں گی، بسا اوقات بے جا طوالت بھی خلجان کا باعث ہوگی، لیکن ان تمام حقائق کے باوجود کتاب کی اہمیت وافادیت اور تمام مشمولات کی علمی وادبی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بالفاظ دیگر یہ آئینہ افکار ہے جس میں پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کی قرآنی فکر اور ان کے اپنے افکار ونظریات ان کی علمی و ادبی اور اصلاحی شخصیت کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

☆☆☆